ناشر — نیا دور پبلیکیشنز حیدر آباد

طابع — اردو ڈائجسٹ پرنٹرز لاہور

تعداد اشاعت — ایک ہزار

کتابت — نذیر انور

سرِ ورق — اسلم کمال

اسکیچز — اقبال مہدی

اشاعت اوّل — اکتوبر ۱۹۸۳ء

قیمت — چالیس روپے

محترم اسد اللہ غالب

کی خدمت میں

بہ پرخلوص

ظہیر احمد

۲۷ اکتوبر ۸۳

(۱۳۸)

انتخاب

ہشّام بن عبدالملک حج کو جانے لگا تو طاؤس یمانی کو طلب کیا۔ وہ دربار میں پہنچے ، فرش کے کنارے جوتیاں اُتاریں اور السّلام علیکم کہہ کر خلیفہ کے برابر بیٹھ گئے اور کہا ،کیوں ہشّام تیرا مزاج کیسا ہے ؟ ہشّام کو سخت غصّہ آیا اور کہا ، یہ کیا گستاخانہ حرکتیں ہیں۔ نہ امیرالمومنین کہہ کر خطاب کیا ، نہ کُنیّت کے کے ساتھ نام لیا ، نہ میرے ہاتھ چُومے۔ طاؤس نے کہا ، ہاتھ تو مَیں نے اس لیے نہیں چوُمے کہ مَیں نے حضرت علیؓ سے سُنا ہے کہ صرف دو شخصوں کا ہاتھ چُومنا جائز ہے۔ بیوی کا یا بچّے کا۔ امیرالمومنین کا لفظ اس لیے استعمال نہیں کیا کہ تمام مُسلمان تجھے امیرالمومنین نہیں سمجھتے ، اس لیے مَیں اگر یہ لقب استعمال کرتا تو جھُوٹا ہوتا۔ کُنیّت کی یہ کیفیّت ہے کہ قرآنِ مجید میں خُدا نے انبیاءؑ اور اولیاءؒ کے نام بغیر کُنیّت کے لیے ہیں۔ مثلاً داؤدؑ ، سلیمانؑ ،عیسیٰؑ ،موسیٰؑ اور کافروں کو کنیّت کے ساتھ خطاب کیا ہے مثلاً ابولہب — ہشّام یہ سُن کر متاثّر ہوا اور کہا کوئی اور نصیحت کرو۔ طاؤس نے کہا ، مَیں نے حضرت علیؓ سے سُنا ہے کہ دوزخ میں بڑے بڑے سانپ اور بچھّو ہوں گے جو اُن حکمرانوں کو کاٹیں گے اور ڈنگ ماریں گے جو رعایا پر ظلم کرتے تھے۔

زندگی کا سفر

کتنی عجیب بات ہے کہ جو لوگ اس فانی دنیا سے گزر گئے، منوں مٹی تلے جا دبے جن کی ہڈیاں اس دھرتی کی آنکھ کا سُرمہ بن گئیں
اُن کے لیے میں لکھ رہا ہوں، کہہ رہا ہوں کہ اب بھی زندہ ہیں، بھلا یہ کس طرح ممکن ہے، عقل اسے تسلیم کر سکتی ہے اور نہ شعور اس کی گواہی دے سکتا ہے مگر جن شخصیات کے لیے میں نے یہ عجیب بات زبان اور قلم سے ادا کی ہے، اُن کے نام جیسے ہی ذہن کے پردے پر آتے ہیں تو نگاہوں کے سامنے متحرک تصویریں رقص کرنے لگتی ہیں محسوس ہوتا ہے کہ یہ شخصیات ہمارے ماحول میں رچی بسی ہیں، ہمارے گرد و پیش میں موجود ہیں۔
اُن کے چھوڑے ہوئے نشانات ہماری تاریخ، سیاست، ادب وصحافت اور معاشرت پر اتنے گہرے اور واضح ہیں کہ اگر ہم انہیں اپنی کج روی میں کج فہمی میں مٹانا بھی چاہیں تو مٹا نہ سکیں۔
ان فانی انسانوں نے زندگی کو اس طور سے گزارا کہ جب تک معنوی طور پر زندہ تھے تو ممتاز کہلائے اور اب صرف لفظی طور پر اس جہاں میں باقی ہیں تو محترم قرار پائے ہیں۔
ہر شخص کے نزدیک زندگی گزارنے کے مختلف انداز ہیں لیکن سب کو اس بات سے اتفاق ہے کہ زندگی کا سفر بہت کٹھن اور صبر آزما ہوتا ہے۔
دنیا میں آنکھ کھولنے، ماں کی گود میں لوریاں سننے، باپ کی انگلی پکڑ کر مکتب تک جانے بچپن اور نوجوانی کی سرحدوں کو پھلانگنے اور پڑھ لکھ کر باشعور کہلانے تک بہت سے مراحل ایسے آتے ہیں کہ خود زندگی اپنا اعتبار کھو دیتی ہے۔ شعور کی منزل کے بعد تو یہ قدم قدم پر امتحان لیتی ہے۔

مگر انسان زندگی کی تمام تر مشکلات کے باوجود اسے گزارتا اپنی مرضی سے ہے، کہیں رہنما بن کر، کہیں رہزن بن کر۔ کہیں درویش بن کر، کہیں ڈاکو بن کر۔

وہ عشق و سرمستی، جوانی اور بیخودی کے گھوڑے کو دوڑاتا ہے تو خود کو بے مثل جان لیتا ہے۔ پہاڑوں کی سربلندی، دریاؤں کی جولانی، سیاست کی ہنگامہ آرائی اور اقتدار کی بدمستی کو خاطر میں نہیں لاتا۔

ہر معاشرے نے اپنے انسانوں کے لیے زندگی گزارنے کے بہترین اصول وضع کئے ہیں۔

مگر جب زندگی کا بیشتر حصّہ ان اصولوں کی نفی کرنے میں گزر جاتا ہے اور بڑھاپے کی سرحدیں آ لگتی ہیں تو یکلخت وہی سرکش انسان کفِ افسوس ملتا ہے۔ برگد کے بوڑھے درخت کی طرح راہ گیروں سے رحم و کرم کا طالب ہوتا ہے۔

مگر وقت بڑا بے رحم، اندھا اور بہرہ ہوتا ہے۔ اس پر کسی کی التجاؤں کا اثر نہیں ہوتا۔ نہ سکندرِ اعظم کی، نہ تیمور لنگ کی، نہ شہنشاہ اکبر کی اور نہ ہی بریژنیف، نکسن اور ناصر کی۔ اسے نہ کسی کی عظمت نے ٹھہرنے پر مجبور کیا ہے اور نہ کسی کی بے بسی نے روکا ہے۔ سکندر اعظم کی فتوحات، تیمور لنگ کی جنگجوئی، اکبر کی شہنشاہیت، بریژنیف کی توسیع پسندی نکسن کی نظر فریبی اور ناصر کی مطلق العنانی — سب ہی اس کے جلو میں چلتی ہیں۔

یہ فیصلہ تو بہرحال روزِ قیامت ہی ہوگا کہ دنیا میں کس نے نیکی، امانت، پاکیزگی، شرافت سچائی اور حقوق العباد کے سلسلے میں اپنے اوپر عائد ذمہ داریوں کو پورا کیا اور کس نے ان الفاظ کی حُرمت کو پامال کیا۔ یہ سب کچھ لوحِ محفوظ پر محفوظ ہے اور بالکل اسی طرح محفوظ ہے جس طرح کیمرے میں تصویر آجاتی ہے۔

مگر بہت سے انسان نہ صرف اپنی زندگی کو معاشرے کے بہترین اصولوں کے تحت گزارتے ہیں بلکہ خود ان کی حیات ایک اصول، ایک ضابطے ایک معیار کی علامت بن جاتی ہے۔ انہیں بڑھاپے میں کفِ افسوس ملنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔

ایسے انسانوں کی زندگی شجرِ سایہ دار کی مانند ہوتی ہے جس کے نیچے راہ گیر ٹھہرے بغیر نہیں گزرتے سالہا سال بیت جاتے ہیں مگر نہ جس کی شاخیں سوکھتی ہیں نہ گھنیرا پن ختم ہوتا ہے اور نہ مسافر نوازی جاتی ہے۔

میں نے جب کچھ ایسی ہی خصوصیات کے حامل انسانوں کے حالاتِ زندگی کو ترتیب دینے کا سلسلہ شروع کیا تو میرے نزدیک مقصد یہی تھا کہ ان انسانوں کو ہم اچھے احساسات کے ساتھ اپنے اطراف میں محسوس کریں، انہیں اپنی تمام تر خوبیوں کے ساتھ موجود پائیں اور ان کی بشری کمزوریوں کو فراموش کر کے ان کے اوصاف کو مثال بنائیں۔

اس کتاب کی تیاری میں مجھے چھ ماہ کا عرصہ لگا۔ خاصی صحرا نوردی کرنی پڑی۔ کچھ ایسے بیٹے بھی ملے جن کے پاس اپنے باپ کا ذکر سننے کے لئے فرصت نہ تھی یا یوں کہیے کہ انہیں اپنے باپ کو اپنی صورت دکھانے کا یارا نہ تھا اور کچھ ایسے بیٹے بھی ملے جنہوں نے اپنے باپ کی زندگی کے واقعات کو جمع کرنے کے لیے سینکڑوں میل کا سفر طے کیا۔ رنگین صفحات کی طباعت کی ذمہ داری قبول کی۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کے بیٹے محمدؐ اکرام الحق اور مظہر الحق میرے کلماتِ تحسین کے بجا طور پر حقدار ہیں۔

تاہم یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ تلخیوں اور کلفتوں کے مقابلے میں نظر نوازی کا پلڑا بھاری رہا خدا ایسی نگاہوں کو ہمیشہ روشن رکھے۔ میں یہاں دو باتوں کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں۔

پہلی تو یہ کہ کتاب میں اشتہارات کچھ سجتے نہیں، اس سلسلے میں عرض ہے کہ واقعی نہیں سجتے مگر کیا کروں کہ میرے پاس حوصلہ بھی ہے اور صلاحیت بھی لیکن اتنا سرمایہ نہیں کہ ایسی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام کر سکوں اور انہیں کم قیمت پر فروخت بھی کروں اس لیے اگر یہ بات گراں گزرے تو مجبوری سمجھ کر معاف کر دیجئے گا۔

دوسری اہم بات یہ کہ ترتیب میں نام جس طرح آئے ہیں، اس کے سبب کوئی زیادہ اہم اور کوئی غیر اہم نہیں ہو گیا۔ میرے لیے یہ تمام ہستیاں محترم ہیں۔ ان سے میری محبّت اور عقیدت میرے الفاظ سے عیاں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ آپ فہرست بناتے ہوئے اس ترتیب کو بدل دیتے مگر میرے نزدیک اہمیت ترتیب کی نہیں توازن کی ہے جو میں نے تحریر میں برقرار رکھنے کی کوشش کی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہمیں لوگوں کی اچھائیاں پرکھنے کی توفیق دے

ظہیر احمد - حیدر آباد

اکتوبر ۱۹۸۴ء

- شیخ عبدالمجید سندھی
- میر رسُول بخش خان تالپور
- قاضی محمّد اکبر
- مولانا عبدالقیوّم کانپوری
- نواب مظفّر حسین خاں
- حافظ مبارک علی شاہ
- ڈاکٹر محمّد اسمٰعیل نامی
- خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز
- نامدار خان ایڈووکیٹ
- سیٹھ ولی بھائی اکبر جی
- محمّد عثمان ڈیپلائی
- سیّد سردار علی شاہ
- ڈاکٹر محمّد ابراہیم خلیل شیخ
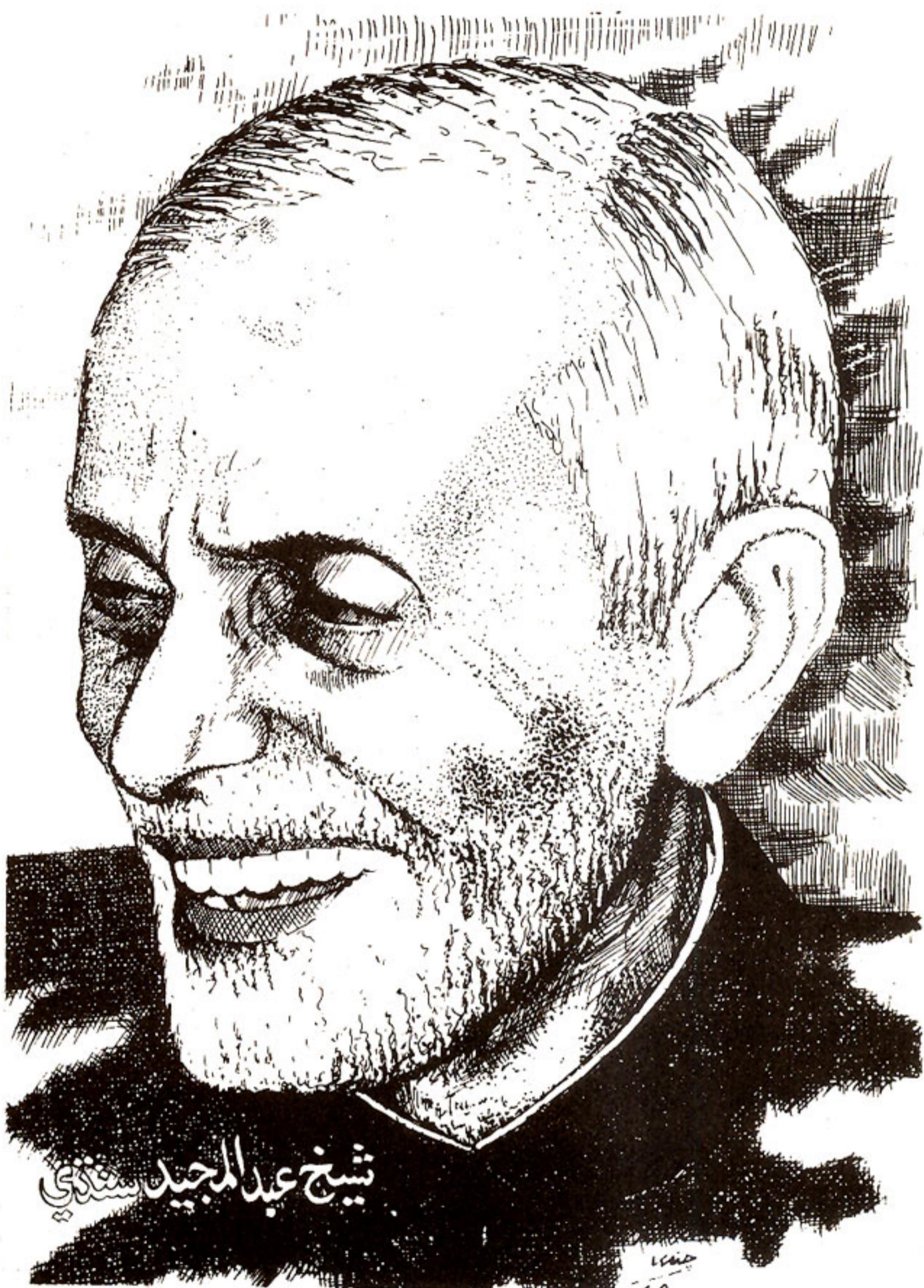
۷، جولائی ۱۸۸۸ء ٹھٹھہ

۲۴، مئی ۱۹۷۸ء حیدر آباد

شیخ عبدالمجید سندھی

شیخ عبدالمجید سندھی تحریکِ آزادی کے نامور رہنما حیدرآباد ہی کے سپوت تھے۔ ان کی موت پر میرے قلم نے ہفت روزہ "بادبان" ۱۲ جون ۱۹۷۸ء کے صفحات پر ان الفاظ میں ماتم کیا تھا:

"شیخ عبدالمجید سندھی کا انتقال ہو گیا۔ وہ ۲۴ مئی کی صبح اسپتال کے گوشۂ گمنامی میں چل بسے۔ لیکن موت کی خبر نے انہیں میدانِ ناموری میں لا کھڑا کیا۔ وہ مسلمان قوم کے درمیان جی رہے تھے، ہم اپنی روایات کے مطابق کسی تاریخ ساز شخصیت اور کسی نامور انسان کو اس کی موت سے پہلے مانتے اور پہچانتے ہوئے شرماتے ہیں اور موت کے بعد اسے تحسین سے اتنا نوازتے ہیں کہ روح بھی شرما جائے۔

شیخ سندھی کے بیٹے ایک بار کراچی کے اخبار میں جب یہ اشتہار چھپا کہ وہ گم ہو گئے ہیں گھر سے فجر کی نماز کے لیے نکلے تھے مگر راستہ بھول گئے، اگر کسی صاحب کو ملیں تو ازراہِ کرم اس پتے پر مطلع کرے وغیرہ وغیرہ، تو اہلِ دل پر قیامت ٹوٹ پڑی تھی کہ افسوس یہ دن بھی دیکھنے تھے کہ دنیا ہمارے قومی لیڈروں کی گمشدگی کے اشتہارات پڑھے۔

شیخ عبدالمجید سندھی کی زندگی کے آخری پچیس برس جس کسمپرسی اور بے چارگی میں گزرے اور ان کی قوم اور ہم عصروں نے انہیں جس طرح فراموش کیا وہ ہماری زندگی کا ایک المناک باب ہے۔ کہتے ہیں شیخ سندھی کی موت سے ایک روز قبل ان کے ایک انتہائی قریبی عزیز نے اپنے

دوست سے کہا۔ "آج شیخ عبدالمجید سندھی کو پوچھنے والا کوئی نہیں، وہ اسپتال میں بیمار پڑے ہیں، لیکن اگر وہ مر گئے تو دیکھنا دنیا ٹوٹ پڑے گی"۔ اور صرف ایک روز بعد ہی جب شیخ سندھی تقریباً نوّے سال کی عمر میں دنیا سے رخصت ہوئے تو بوڑھوں نے بتایا کہ ہم کتنے عظیم سرمائے سے محروم ہو گئے اور جوانوں نے حیرانی سے کہا۔ "اچھا یہ بوڑھا آدمی وہی ہے جو ہماری آزادی کا متوالا تھا، یہی ہے جس نے ہمارے مستقبل کے لیے آزادی کی جنگ لڑی"۔

تاریخ مختصر بھی ہے اور طویل بھی، تاریک بھی اور روشن بھی، سبق آموز بھی اور قابلِ تقلید بھی مگر اہمیت کاغذ کے اوراق کو نہیں، اُس شخصیت کو ہے جو تاریخ ساز ہے اور ان اوراق پر پھیلی ہوئی ہے۔

۱۸۸۸ء کے جیٹھا نند اور ۱۹۰۸ء کے شیخ عبدالمجید سندھی کو اگر ان صفحات سے جدا کر دیا جائے تو پھر کورے کاغذ کے سوا کچھ بھی نہیں بچتا، کورے کاغذ کو کس نے پڑھا ہے۔

شیخ صاحب کے آباؤ اجداد سہون شریف ضلع دادو میں رہائش پذیر تھے، بعدازاں وہ ٹھٹھہ چلے آئے۔ یہاں ۷ رجولائی ۱۸۸۸ء کو دیوان لیلا رام کے گھر ایک لڑکا پیدا ہوا جس کا نام جیٹھا نند رکھا گیا۔ جیٹھا نند نے ابتدائی تعلیم کے وقت ہی سے تلاشِ حق کے سفر کا آغاز کر دیا تھا۔ اسکول جاتے ہوئے مسکین شاہؒ کے مزار کے سائے میں سوچ بچار اور بزرگوں کی باتیں اس کے ذہن پر اثر انداز ہوتی رہیں۔ اسکول ہی کے زمانے میں اس نے قرآن پاک کا مطالعہ کیا۔ جب میٹرک پاس کر لیا، تو ایک وکیل دیپ چند کے پاس کلرک کے طور پر کام کرنے لگا۔ یہ اس نوجوان کی زندگی کا اہم دور تھا۔ تلاشِ حق کا سفر پورا ہو چکا تھا۔ جب تاج محمدؒ اور میر محمدؒ بلوچ کی صحبت میں اسلام کی سچائیاں آشکارا ہوئیں، تو جیٹھا نند نے تاریخی فیصلہ کیا اور نوکری سے استعفیٰ دے کر تنخواہ کی معمولی رقم کے ساتھ حیدرآباد آ گیا۔ یہاں شیخ عبدالرحیم اسلام کی تبلیغ و اشاعت میں مصروف تھے۔ نوجوان جیٹھا نند نے ۱۰ر فروری ۱۹۰۸ء کو شیخ عبدالرحیم کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا اور عمر کے بیسویں سال سے شیخ عبدالمجید کا آغاز ہوا۔

یہ وہ دور تھا جب سندھ کی سیاست اور قیادت، معیشت اور معاشرت پر ہندوؤں کا بے پناہ غلبہ تھا۔ شیخ عبدالمجید کے قبولِ اسلام نے ہلچل مچا دی۔ تمام بااثر ہندو دشمنِ جان ہو گئے، لیکن روائتی ہتھکنڈے بھی شیخ عبدالمجید کو راستے سے نہ ہٹا سکے۔ ریشمی رومال کی تحریک چلی اور شیخ عبدالمجید نے افغانستان اور ہندوستان کے طویل سفر کر کے انگریزی استعماریت کے خلاف بیداری کا

پیغام پہنچایا، تو وہ شیخ عبدالمجید سندھی بن گئے اور اسی نام سے معروف ہوئے۔

انہوں نے ابتداً غلام محمدؒ بھرگڑی کے پولیٹیکل سیکرٹری کی حیثیت سے کام کیا اور سندھ میں قومی سیاست کی بنیاد رکھی۔ اس عرصے میں اخبار "الامین" کی ادارت کے فرائض بھی ادا کئے۔ یہ ۱۹۱۰ء سے ۱۹۱۴ء تک کا دور ہے۔ ریشمی رومال تحریک کے دوران اہم کردار ادا کرنے میں انہیں پہلی بار ۱۹۱۶ء میں گرفتار کیا گیا۔ اس مقدمے میں ان پر بغاوت کا الزام عائد کرکے تین سال کی سزا سنائی گئی۔ یہ عرصہ زنسا گری جیل میں گزارا، جہاں سے ۱۹۱۹ء میں رہا ہوئے۔ ۱۹۲۰ء میں انہیں خلافت تحریک کے سلسلے میں دو سال کی سزا سنائی گئی۔ اس کے بعد بارہ ماہ کے لیے نظر بند کیا گیا، جس کے بعد دسمبر ۱۹۲۴ء میں رہائی حاصل ہوئی۔ پہلی اور دوسری گرفتاری کے درمیان انہیں احمد آباد "سنئیہ گرہ کیس" میں بھی تین ماہ کی جیل بھگتنا پڑی تھی۔

ریشمی رومال اور خلافت تحریک جنہوں نے برِّصغیر میں آزادی کی چنگاری کو بھڑکایا اور سوئی ہوئی قوم کو بیدار کیا، میں تاریخی کردار ادا کرنے کے بعد شیخ عبدالمجید نے ایک دوسرا محاذ منتخب کیا۔ یہ محاز سندھ میں خصوصاً اور برِّصغیر میں عموماً ہندوؤں کے ہاتھوں مسلمانوں کے معاشی، سیاسی اور تعلیمی استحصال کا محاذ تھا۔ وہ اس استحصال کے خلاف سندھ کے معروف اخبار "الوحید" کے ذریعے پوری طرح ڈٹ گئے۔ انہوں نے "الوحید" کے بانی ایڈیٹر کی حیثیت سے بمبئی پریذیڈنسی سے سندھ کی علیحدگی کے لیے زبردست تحریک چلائی اور مسلمانوں میں سیاسی شعور بیدار کیا۔ جب سندھ بمبئی سے الگ ہوا، تو انہوں نے "الوحید" کا آزاد سندھ نمبر نکالا جو سندھی صحافت میں تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا یہ دور ۱۹۲۵ء سے ۱۹۲۵ء تک محیط ہے۔

جب پہلی سندھ اسمبلی کے پہلے انتخاب کا مرحلہ درپیش آیا، تو شیخ سندھی، انگریزی وفاداری کے علمبردار شاہ نواز بھٹو کے مقابل ڈٹ گئے۔ ۱۹۳۷ء میں لاڑکانہ میں ایک نومسلم غریب صحافی اور مخلص سیاسی کارکن نے ایک جاگیردار اور انگریزوں کے وفادار کو اس کے اپنے شہر میں اس طرح شکست دی کہ سندھ کی سیاسی تاریخ میں اسے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کے بعد شیخ سندھی نے مسلم لیگ کی تنظیم اور کامیابی کے لیے جی ایم سیّد کے شانہ بشانہ کام کیا۔ ۱۹۳۸ء میں کراچی میں ہونے والے مسلم لیگ کے کل ہند اجلاس اور قیامِ پاکستان کے لیے قرارداد کی منظوری اور پھر ۱۹۳۸ء ہی میں الہ آباد میں کل جماعتی کانفرنس کے انعقاد میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیا۔ مولانا محمدؒ علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خان اور تحریکِ آزادی کی دوسری نامور

ہستیوں سے شیخ عبدالمجید کے تعلقات رہے۔

قیامِ پاکستان سے قبل سندھ میں بننے والی مسلم لیگ کی حکومت میں وہ ایوب کھوڑو میر بندے علی تالپور اور جی ایم سیّد کے ساتھ وزیر لیے گئے۔ ابتداً انہیں مالیہ اور پھر تعلیم کی وزارت دی گئی۔ انہوں نے طویل سیاسی زندگی میں ریشمی رومال تحریک، خلافت تحریک، تحریک عدمِ تعاون، خدام بھٹہ سوسائٹی، مسلم کانفرنس، انڈین نیشنل کانگریس، مسلم لیگ، پاکستان عوامی پارٹی اور سندھ عوامی محاذ کے پلیٹ فارموں سے مسلمانوں کی آزادی روزگار، تعلیم، سیاسی اور معاشی ترقی اور حقوق کے لیے زبردست جدّوجہد کی۔ وہ قیامِ پاکستان سے قبل ہی مسلم لیگ سے اختلافات کے سبب علیحدہ ہوگئے اور قیامِ پاکستان کے بعد خان عبدالغفار خان کے ساتھ مل کر پاکستان عوامی پارٹی کی بنیاد رکھی، اور سندھ کے کنوینر ہوئے۔ یہ پارٹی بعد میں پاکستان نیشنل عوامی پارٹی کے نام سے اُبھری۔ آخر میں انہوں نے جی ایم سیّد کے سندھ عوامی محاذ میں کام کیا۔

شیخ عبدالمجید نے کئی کتابیں لکھیں اور کئی مشہور کتابوں میں ان کی زندگی کے حالات پر بھی روشنی ڈالی گئی۔ جی ایم سیّد نے اپنی کتاب میں شیخ سندھی کے ساتھ گزارے ہوئے لمحات کا تذکرہ کیا ہے۔ کہا جاتا ہے بھارت میں شائع ہونے والی کتاب "فریڈم فائٹرز" میں تحریکِ آزادی کے رہنماؤں کا ذکر ہے اور شاندار الفاظ میں شیخ عبدالمجید سندھی کو بھی خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔

شیخ سندھی کی موت کے بعد تحریکِ پاکستان کے رہنما قاضی محمدؐ اکبر نے "سندھ نیوز" کی ۲۷ مئی کی اشاعت میں ایک مضمون میں انہیں زبردست خراجِ عقیدت پیش کیا۔ انہوں نے لکھا ہے "شیخ صاحب کو مولانا محمدؐ علی جوہر، مولانا شوکت علی، مولانا ظفر علی خاں، مولانا حسرت موہانی اور دوسرے کئی ہندو مسلم زعمأ کا ہم عصر اور ہم پلہ رہنما شمار کیا جائے گا۔" اس کے بعد لکھا ہے، "سندھ کی علیحدگی اور بعد میں قیامِ پاکستان کی منزل حاصل کرنے کے لیے جدّوجہد میں سندھ کے اس سچے سپوت نے بے مثال ایثار اور قربانی کی مثال قائم کی۔" مزید لکھتے ہیں۔

"سابقہ عوامی دورِ حکومت میں اُمید تھی کہ شیخ صاحب جیسی نازک و نایاب ہستی کی رہائش اور خدمت کا مناسب انتظام کیا جائے گا۔ کراچی کے سول اسپتال کے سامنے ایک خیراتی ٹرسٹ بلڈنگ میں شیخ صاحب نے عمر کے آخری ۳۵ سال گزارے، یہ عمارت انہیں مفت دی جاتی، مگر افسوس کہ معاملہ سرکاری دفاتر کے سُرخ فیتوں میں پھنسا رہا اور بالآخر شیخ صاحب کے خاندان والوں کو یہ متروکہ جائداد لینے کے لیے زرِ کثیر خرچ کرنا پڑا، شیخ سندھی مرحوم کا ایک فرزند انور شیخ

اسسٹنٹ کمشنر کے عہدے پر فائز تھا، اسے ۱۳۰۰ افسران کی فہرست میں شامل کر کے نوکری سے نکال دیا گیا، وہ آج کل امریکہ میں کامیابی سے وکالت کر رہا ہے۔" آخر میں "قدر شناسی" کا تذکرہ یوں کیا، شیخ سندھی جیسے متبرک، مسکین، مخلص اور مجاہد انسان کی زندگی کے آخری ۳۰ سال مایوسی، بے کسی اور بے بسی کے بھیانک دور میں گزرے، خدا مرحوم کی اولاد پر رحم کرے جس نے اپنے عظیم والد اور اس قدر ناشناس قوم کے گوہر نایاب کو سنبھالے رکھا اور خدمت کے فرائض بھی بخوبی سرانجام دیئے، بہر حال مسلمانوں اور خصوصاً سندھی مسلمانوں نے اپنے مربّی و محسن مجاہدوں اور خدمت گاروں کی بے قدری کی روایت قائم رکھتے ہوئے اب مرحوم شیخ سندھی کے مزار اور یادگار کے منصوبوں پر سوچنا شروع کر دیا ہے، بعد از مرگ واویلا ہمارے قومی کردار کا اہم حصہ ہے۔"

شیخ سندھی کی موت پر تعزیت کرنے والوں میں حکمرانوں کے علاوہ سیّد مودودی، میر رسُول بخش تالپور اور جی ایم سیّد جیسے رہنما بھی شامل تھے۔

شیخ عبدالمجید سندھی جن کی نوے ویں سالگرہ ۷ جولائی ۱۹۷۸ء کو منائی جاتی، ڈیڑھ ماہ قبل ہی اپنی ۷۵ سالہ رفیقۂ حیات، ۲ بیٹوں اور ۴ بیٹیوں کے علاوہ بہت سے نواسے نواسیوں اور پوتے پوتیوں کو سوگوار چھوڑ کر اس دار فانی سے کوچ کر گئے، اس کے ساتھ ہی ہماری تاریخ کا وہ باب ختم ہو گیا جو اگر آج بھی نئی نسل تک منتقل کر دیا جائے تو شیخ سندھی کے جانشین پیدا ہو سکتے ہیں۔"

جی ایم سیّد کے بقول "سندھ کی ایماندارانہ اور اصولی سیاست کا آخری باب ہم سے جُدا ہو گیا۔" انہوں نے لکھا کہ شیخ عبدالمجید سندھی میرے سیاسی اُستاد اور سندھ کے سیاسی رہبر تھے، سندھ کے عاشق تھے، بمبئی سے سندھ کی علیحدگی میں ان کا بڑا ہاتھ تھا، ون یونٹ توڑنے کے لیے نہ صرف کتاب لکھی بلکہ ہر معاملے میں رہنمائی بھی کی۔ خان عبدالغفار خان، خان عبدالصمد خان اچکزئی اور مولانا بھاشانی بھی جب یکجا ہوتے تھے، تو کہتے تھے کہ شیخ صاحب کے مشورے کے بغیر کام ادھورا رہ جائے گا۔" جی ایم سیّد نے حسام الدین راشدی مرحوم کا قول نقل کیا ہے کہ "سندھ ماں ہے، مائیں ہی مر گئیں جو ایسے فرزند پیدا کریں۔"

شیخ عبدالمجید سندھی کے انتقال کے بعد خان محمدؐ پنھور نے ان کی زندگی کے حالات اور تصاویر پر مشتمل کتاب "اگر زندہ ہوتے" شائع کی۔ "نعرہ مستانہ" شیخ عبدالمجید سندھی کے کالم کا

عنوان تھا جو وہ "الوحید" میں لکھتے تھے ۔ ان کے کالموں کا مجموعہ اسی عنوان سے کتاب کی صورت میں شیخ عبدالمجید سندھی اکیڈمی نے شائع کیا۔

شیخ صاحب کے تین بیٹوں میں سب سے بڑے انور شیخ امریکہ میں ہیں، جبکہ خالد شیخ پولیس میں افسر ہیں اور ان دنوں خیرپور کے ایس پی ہیں، چھوٹے بیٹے طارق کراچی میں کاروبار کرتے ہیں۔

پہلی بیوی سے ایک بیٹی تھی اور دوسری بیگم سے جو ابھی حیات ہیں، تین صاحبزادیاں ہیں۔ جن کی شادیاں بالترتیب عبدالجبار شیخ، ڈاکٹر اسماعیل شیخ اور اے کے ہمیرانی سے ہوئی ہیں۔ عبدالجبار شیخ بلدیہ حیدرآباد میں ملازم تھے، اب اپنا کاروبار کر رہے ہیں، ڈاکٹر اسماعیل شیخ صدر میں اپنے نامور باپ ڈاکٹر ابراہیم خلیل شیخ کی کلینک سنبھالے ہوئے ہیں اور جناب ہمیرانی سماجی بہبود کے ادارے میں ڈائریکٹر ہیں۔
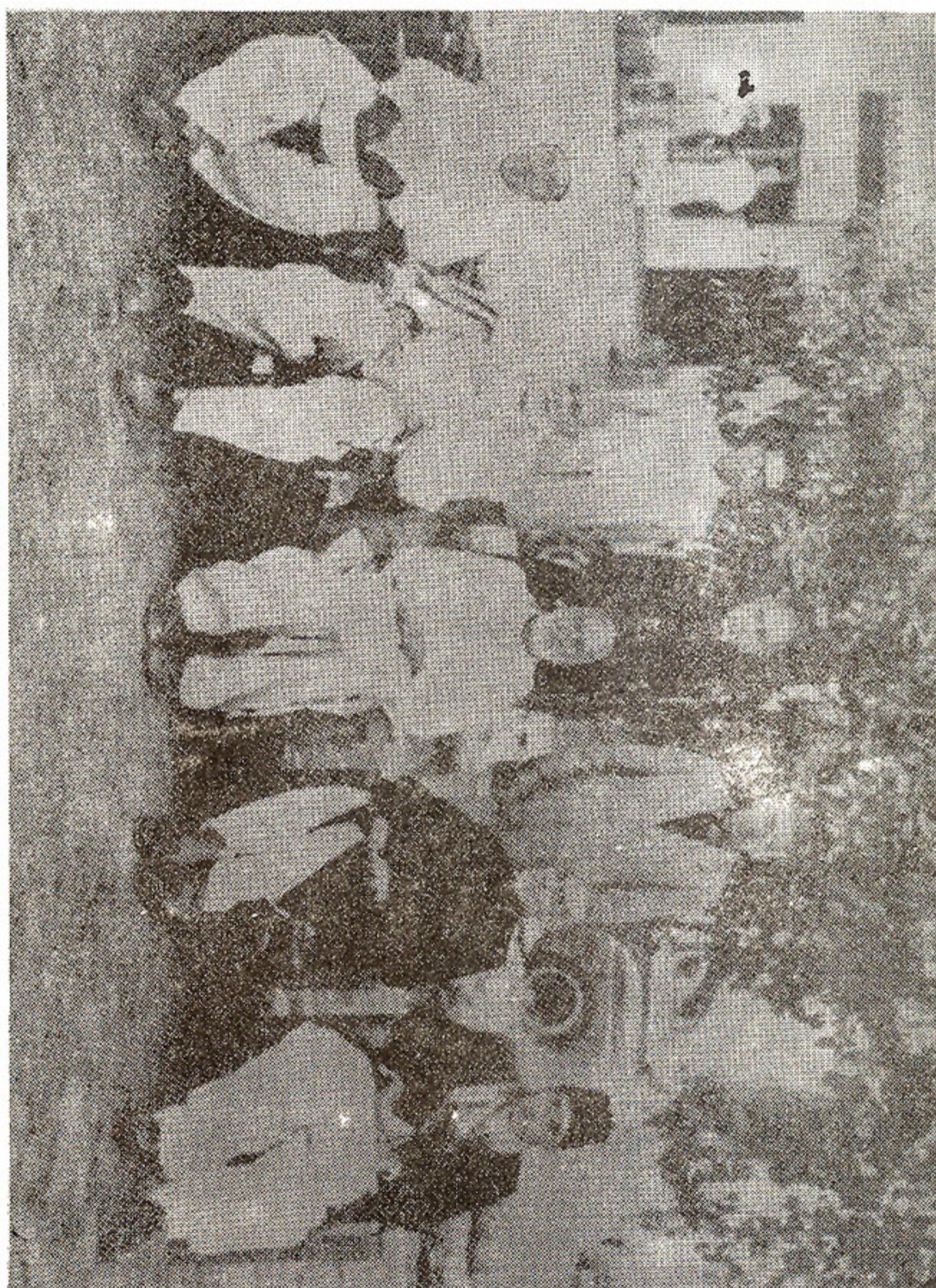
پشاور میں ایک یادگار گروپ فوٹو۔ بیٹھے ہوئے دائیں سے
رئیس غلام مصطفیٰ بھرگڑی، شیخ عبدالمجید سندھی، خان عبدالغفار خان، عبدالصمد اچکزئی
اور محمد حسین عنقا۔ پشت پر کھڑے ہوئے حیدر بخش جتوئی، جی ایم سید اور ریاض ہاشمی (۱۹۵۶)

جی ایم سیّد اپنی ۷۶ویں سالگرہ پر کیک کاٹ رہے ہیں۔
شیخ عبدالمجید سندھی اور بیگم ممتاز راشدی دائیں بائیں کھڑے ہیں۔

شیخ عبدالمجید سندھی کے آخری ایّام کی تصویر۔ اپنے بیٹے طارق شیخ،
ڈاکٹر غلام علی الانا اور خان محمدؐ پنھور کے ہمراہ (جنوری ۱۹۷۸ء)
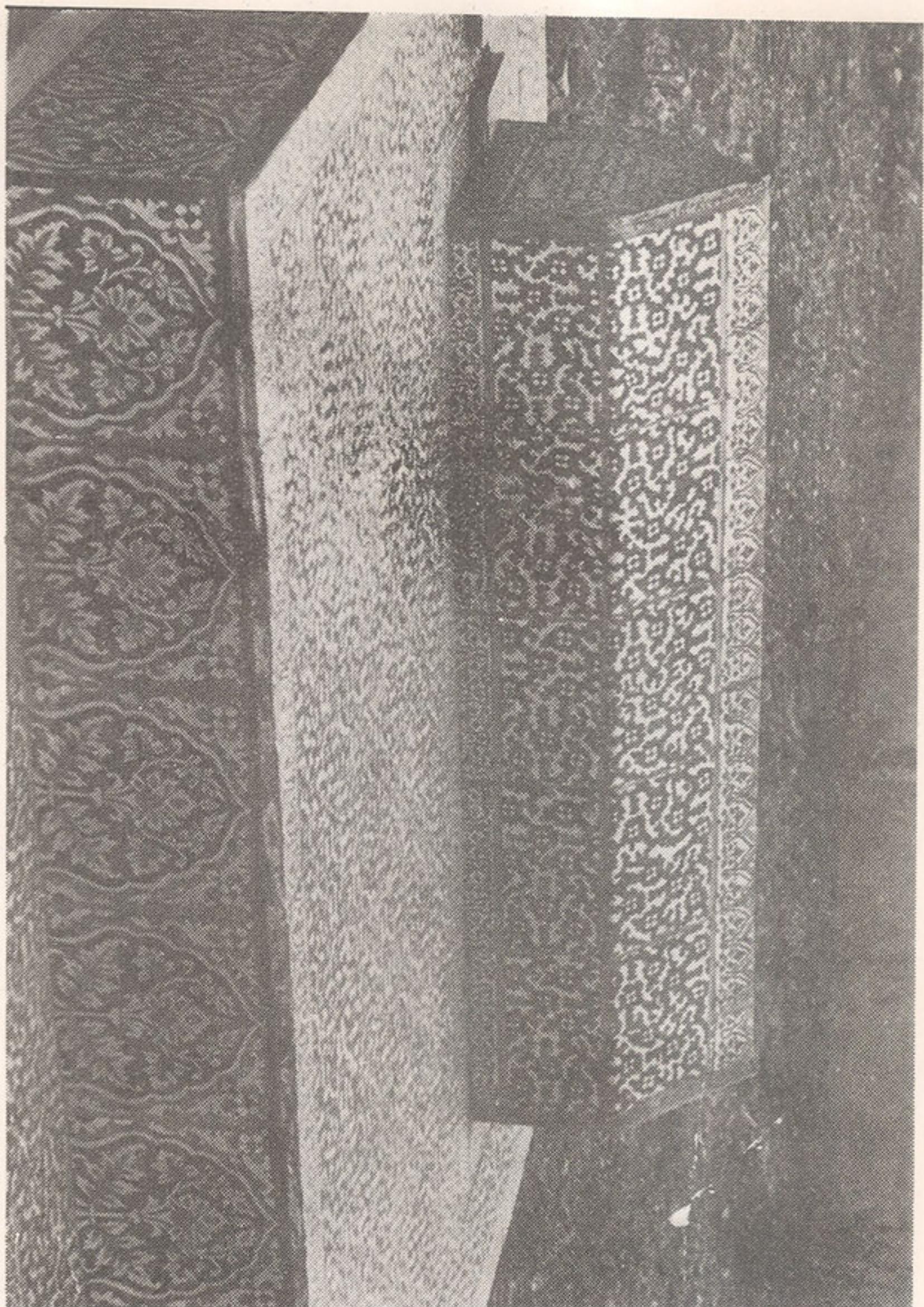
مکلی ٹھٹھہ میں شیخ عبدالمجید سندھی کی آخری آرام گاہ ۔ یہ تصویر
پیر حسام الدین راشدی مرحوم نے اُتاری (بشکریہ خان محمدؐ پنھور)
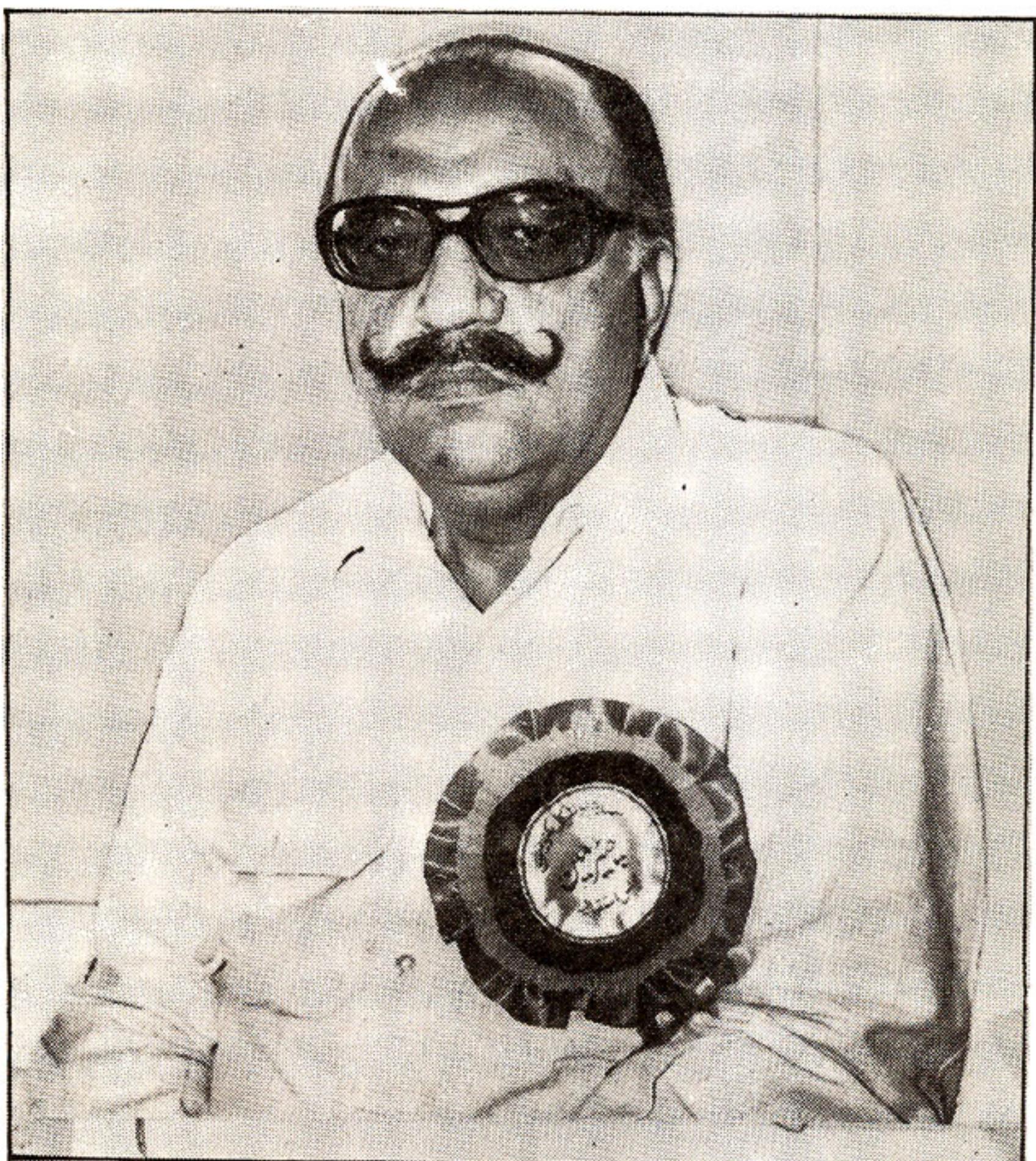
۱۹۲۹ء حیدرآباد
یکم مئی ۱۹۸۲ء کراچی

میر رسول بخش خان تالپور

میر رسول بخش تالپور کے انتقال پر ذہن اتنا ماؤف اور قلم اتنا بے بس ہوا کہ مسلسل ایک سال تک اس موضوع پر کچھ نہ لکھ سکا، اس کا سبب شاید یہ تھا کہ میرے لیے یہ صدمہ سچ مچ ناقابل برداشت تھا۔ تمام دن غم گساروں اور جلوس جنازہ میں شریک ہر طبقہ زندگی کے افراد کے ساتھ، بلکہ ان کے ہجوم میں چھپ کر روتا رہا اور شام ڈھلے میر صاحب کے ایک سیاسی رفیق وسیم عثمانی کے ہمراہ گھر کو لوٹا تو اتنا نڈھال تھا، جیسے دل والوں کی مال و متاع لُٹ جاتی ہے۔

میر صاحب سے میرا اتنا گہرا تعلق کس طرح استوار ہوا یہ ایک اہم سوال ہے کیونکہ نہ میں انکا سیاسی ہمسفر تھا، نہ ہم عصر، اور نہ ہی ہم عمر نہ کسی اخبار کا معروف ایڈیٹر نہ ٹریڈ یونین لیڈر، مگر اس کے باوجود گورنری چھوڑنے کے وقت سے لے کر موجودہ دور میں وزارت سنبھالنے تک میں اُن کے اس مختصر سے حلقہ احباب میں شامل رہا۔ جس کی نشستیں ہفتوں تک بلا ناغہ ہوتی تھیں۔ انہوں نے مجھے جو محبّت اور عزّت دی میں اس کا حق اپنے ان حقیر الفاظ کے ساتھ ادا نہیں کرسکتا۔ مجھے نہیں معلوم کہ میر صاحب کے دل میں میرے لیے یہ محبت کیوں پیدا ہوئی، لیکن مجھے اتنا ضرور معلوم ہے کہ انہوں نے مجھے ہمیشہ اپنے ذاتی دوست کی حیثیت سے پکارا اور ایک اچھے صحافی کی حیثیت سے متعارف کرایا۔ اسی طرح میر صاحب کے اندازِ سیاست نے مجھے بھی بے پناہ متاثر کیا۔ کیونکہ اس میں نہ مکر و فریب تھا نہ احساس برتری، نہ نمایاں ہونے کی خواہش تھی نہ نیچا دکھانے کی آرزو، نہ اپنے دین دار اور پارسا ہونے کا زعم، نہ داڑھیوں پر ہاتھ پھیر کر دلِ بے رحم کے ساتھ مالِ مفت ہضم کرنے کی عادت، موڈ ہوا تو وینس سینما کے نزدیک پٹرول پمپ پر بیٹھ گئے۔

طبیعت میں آئی تو سائیں جیز ہوٹل میں چکن تکہ کھاتے چلے گئے اور زیادہ موڈ بنا تو عاجز فریدی مرحوم کو باغ میں بلوا کر سیخ کباب بنوا لیے۔ میر رسول بخش کھدر پوش ہونے کے باوجود ذوقِ لطیف کے مالک تھے۔ مگر ہر حال میں خود کو ڈھالنا جانتے تھے۔ جیسے اندر سے تھے ویسے ہی باہر سے نظر آتے تھے، اپنے حلقۂ احباب میں شامل کمتر اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے سبب کبھی نادم و پشیماں نہ ہوئے اور نہ اپنی اس "کمزوری" کو چھپانے کی کوشش کی۔

میر صاحب کا یوم وفات یوں بھی مجھے تا زندگی یاد رہے گا کہ یہی دن "جسارت" سے میرا "یوم انتقال" بھی ہے۔ میں نے "صالحین" کی الزام تراشی اور کردار کشی کی طویل مہم کے بعد اس دن استعفیٰ دے دیا تھا اور ملازمت پر بالکل اسی طرح لات ماردی تھی، جس طرح میر صاحب گورنری چھوڑ کر "کوفہ" سے نکل آئے تھے۔ میر صاحب کی زندگی پر ایک سال تک نہ لکھنے کی ایک وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ میں تقریباً آٹھ ماہ تک صحافت کے میدان میں بے تیغ رہا۔ لیکن جب ان کی پہلی برسی آئی تو "جنگ" کے لیے کام کر رہا تھا۔ لہٰذا یکم مئی ۱۹۸۳ء کو میرا مضمون اس اخبار میں شائع ہوا، میں نے لکھا تھا:

میر رسول بخش تالپور کی شخصیت اور زندگی پر لکھنا جتنا آسان ہے اُتنا ہی مشکل بھی ہے۔ آسان اس لیے کہ وہ سراپا عوامی آدمی تھے، انہیں تانگے والا، رکشہ والا، پان سگریٹ والا، ریڑھی خوانچے والا، ہر شخص نزدیک سے جانتا اور پہچانتا تھا، جب اور جس وقت چاہے ملاقات کر سکتا تھا، اور مشکل اس پہلو سے ہے کہ ایسے عوامی شخص کی زندگی کے واقعات کا سمندر کے کنارے کی طرح کوئی کنارا دکھائی نہیں دیتا کہ جہاں سے ابتدا کی جائے اور جہاں الفاظ کی کشتی لنگر انداز ہو۔

میر رسول بخش میں محبّت اور اخوّت، بہادری اور عاجزی، فقیری اور درویشی، شاہی اور یاری کی صفّات اس طرح یکجا ہو گئی تھیں کہ بلاشبہ سندھ کی سرزمین برسوں ایسے فرزند کو ترسے گی، جو پیدا تو ہوا جاگیردار ماحول میں، حکمران گھرانے میں، لیکن زندگی بسر کی مزدوروں کے انداز میں، خادموں کے طریقے پر۔

میر رسول بخش تالپور نے بقول شورش کاشمیری کے اُس دور میں سیاست میں قدم رکھا تھا جب سیاست کا صلہ آہنی زنجیریں تھیں اور خان زادوں کے لیے مفت کی جاگیریں تھیں، مجھ سے کہا کرتے تھے کہ پورے پاکستان میں کوئی جیل ایسی نہیں، جہاں یہ خادم نہ رہا ہو۔

میر رسول بخش تالپور، میر حاجی نبی بخش خان تالپور کے گھر ۱۹۲۹ء میں اسی شہر میں پیدا ہوئے۔

جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیم حاصل کی۔ میر صاحب کے علاقے کو ٹنڈو میر محمود کہا جاتا ہے، جو میر محمود علی خان تالپور کے نام سے منسوب ہے۔ میر محمود اٹھارویں صدی میں سندھ کے مشہور حکمران میر نصیر خاں کے بھائی تھے۔

میر رسول بخش کی سیاسی زندگی کا آغاز مزدور تنظیموں اور ایسوسی ایشنز کے سرپرست اور آرگنائزر کی حیثیت سے ہوا۔ انہیں سنّو سے زائد ٹریڈ یونینز آرگنائز کرنے یا ان کا سرپرست بننے کا اعزاز حاصل ہے۔ میر صاحب کے پاس جو بھی پہنچا خواہ وہ "تانگے والا ہو یا رکشہ والا" میر صاحب نے اس کی سرپرستی کرنے میں عار محسوس نہ کی۔ وہ معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے اور باغی انسانوں کو بلاامتیاز رنگ، نسل اور زبان سینے سے لگانے کے لئے تیار رہتے تھے۔

حبیب جالب ہوں یا فیض احمد فیض، احمد فراز ہوں یا منشی محمد ابراہیم، دوسری جانب شورش کاشمیری ہوں یا مجید لاہوری، مولوی خیر محمد نظامانی ہوں یا مولانا چراغ حسن حسرت، میر رسول بخش تالپور کی محبت نے انہیں ہمیشہ اپنا "اسیر" رکھا اور انہوں نے یہ "اسیری" بخوشی قبول کی۔ ہر دور کے یہ "باغی اور سرکش" میر صاحب کے لیے ہمیشہ بریشم کی طرح نرم رہے، خواہ آپ وزارت میں رہے ہوں یا وزارت سے دُور۔

پچھلے دنوں فیض صاحب نے پاکستان آنے سے پہلے میر صاحب کو خط لکھا تو بہت لطیف پیرائے میں ان کے سینئر وزیر بننے کا تذکرہ کیا۔ فیض صاحب نے میر صاحب کا تکیۂ کلام "بادشاہی جی خیر" دُہراتے ہوئے لکھا "میر صاحب سنا ہے آپ بادشاہ ہو گئے ہیں لہٰذا بادشاہی کی خیر ہو۔" میر صاحب مرحوم نے مجھ سے اس خط کا تذکرہ کیا اور کہا یہ شاعر اور ادیب تو ہمارے معاشرے کی رونق ہیں، ہماری تاریخ کا حصّہ ہیں، ان بے ضرر لوگوں سے جو خوف کھاتا ہے مجھے اُس کی حالت پر ترس آتا ہے۔

مجھے حبیب جالب کی آواز میں ریکارڈ شدہ وہ نظمیں سننے کو ملی ہیں، جو جالب نے بطورِ خاص میر صاحب کی نذر کی ہیں۔ اسی طرح شورش کاشمیری بھی میر صاحب کے بے پناہ مدّاح تھے۔ جب سندھ میں لسانی فسادات نے بھائیوں کو بھائیوں سے لڑا دیا اور اس افسوسناک سانحہ میں میر صاحب کی شخصیت داغ دار ہوئی تو شورش نے "چٹان" کے صفحہ اوّل پر میر صاحب کی تصویر اور ایک نظم شائع کر کے انہیں کھلا خط لکھا۔ میر صاحب گورنری چھوڑنے کے بعد اکثر شورش کی حق گوئی کا تذکرہ کرتے اور کہتے تھے جس طرح سے شورش، شاہ جی کا مرید ہے اسی طرح سے میں بھی شاہ جی

کا دیوانہ ہوں۔ اکثر اپنے اس سفر کی یاد تازہ کرتے، جو شاہ جی عطاء اللہ شاہ بخاری کی تقریر سننے کے لیے انہوں نے دلی تک اختیار کیا تھا۔

میر صاحب رہن سہن کے انداز، سیاست اور دوستی و یاری کے معیار میں اپنے بڑے بھائی سے مختلف ہی نہیں بالکل جدا تھے، مگر ان سے اتنی محبت کرتے تھے کہ شاید اپنے بیٹے سے بھی اس قدر نہ رہی ہو۔ یہی حال میر علی احمد کا تھا اور آج بھی ہے۔

میر رسول بخش کی جدائی پر میر علی احمد نے کہا آج میرا باپ مجھ سے بچھڑ گیا، میرا سایہ میرے سر سے اٹھ گیا۔ سننے والوں کو حیرت ہوئی کہ میر رسول بخش تو عمر میں چھوٹے تھے، مگر قریب کے لوگ جانتے تھے کہ سیاست میں واقعی میر رسول بخش اپنے بڑے بھائی کے رہبر تھے۔ نصف صدی کی ان کی محفلیں، ان کی دوستیاں، ان کی کچہریاں، ان کی قربتیں اتنے گہرے نقوش رکھتی ہیں کہ ابھی برسوں تک میر علی احمد تالپور اور تالپور خاندان کے فرزندوں کی رہنمائی کریں گی۔

میر صاحب سندھ میں پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھنے والوں میں شامل تھے۔ لیکن جب فروری ۱۹۷۳ء میں ان کے بھائی کی عزت کا سوال آیا تو شانِ قلندری سے گورنر ہاؤس کو چھوڑ کر چلے آئے۔ ہمیشہ اس امر پر افسوس کرتے تھے کہ ان کے دور میں لسانی فسادات کا سانحہ ہوا اور اس آگ سے وہ اپنا دامن نہ بچا سکے۔ ایک سازش کے تحت ان کی شخصیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی گئی۔

گورنری چھوڑنے کے بعد پیپلز پارٹی کے باغیوں کا کنونشن بلایا تو گویا پیپلز پارٹی کے جسد سے اس کی روح کھینچ لی۔ کسی بھی سیاسی پارٹی کا اثاثہ اس کے مخلص لوگ ہوتے ہیں۔ محمد عرس سموں، منشی ابراہیم، لعل بن یوسف، عرفان ملک، صدیق ویڑھو، میر ضیغم، الطاف رند، کامریڈ میر محمد، مولانا عبدالحق ربّانی، خیر محمد سموں، اسماعیل قریشی، حکیم عبداللطیف، محمد یامین، ماسٹر گل محمد، سیٹھ نور محمد، کالے خان بان والا اور اسی طرح کے بے شمار افراد جن سے دوستی اور تعلق ایسا کہ وقت پڑے تو جان دے دیں۔

محمد یامین نے بالآخر یہ ثابت بھی کیا۔ میر صاحب کے ساتھ روز کچہری کرنے والا محمد یامین ملک کہتا تھا "میر صاحب ہم ایک ساتھ جئیں گے ایک ساتھ مریں گے"، یہ جملہ اس کا تکیہ کلام بن چکا تھا۔ میر صاحب کے انتقال کی خبر ملی تو خود بھی تاخیر نہ کی اور راہیِ ملکِ عدم ہوئے۔ دونوں دوستوں کا جنازہ ایک ہی دن اٹھا۔ وفاداری اور وعدہ نبھانے کی ہوگی کوئی ایسی مثال؟

میر رسول بخش نے سابقہ دور میں گورنری چھوڑنے کے بعد یہ طریقہ اختیار کیا تھا کہ جہاں کہیں

ظلم و زیادتی کی اطلاع ملتی یا جہاں بھی پولیس مقابلہ دکھا کر لوگوں کو مار دیا جاتا میر صاحب فوراً وہاں پہنچ جاتے، تعزیت کرتے اور لوگوں کو تسلی دے کر کہتے گھبراؤ نہیں روزِ حساب قریب ہے۔ اس دور میں ان کی شام اکثر ٹھنڈی سڑک کے ایک کول کارنر پر گزرتیں، جہاں شیخ علی محمد، ظہور انصاری اور چند دوست ساتھ ہوتے۔ یہاں لطائف کی محفل گرم ہوتی، قہقہے اُڑتے اور دلوں کا غبار ہلکا کیا جاتا میں اس محفل کا ایک مستقل ممبر ہوتا۔

میر رسول بخش تالپور قیام پاکستان سے قبل خاکسار اور احرار سے متاثر رہے، قیام پاکستان کے بعد نیپ اور عوامی لیگ سے قریب رہے، پھر پیپلز پارٹی کی بنیاد ڈالی، لیکن جب اس سے دُور ہوئے تو حرفِ غلط کی طرح مٹانے پر تل گئے۔

شدید محبّت ہی کبھی کبھی انتہائی نفرت کو جنم دیتی ہے۔ میر صاحب کے شکوے اور گلے میں ابتداً محبّت کی جھلک بھی ہوتی تھی، مگر پھر حالات ایسے پیدا ہوئے کہ پیچھے پلٹنے کے تمام امکانات ختم ہو گئے۔

اس کے باوجود کہ ۱۹۷۷ء کی انتخابی مہم میں سابق وزیراعظم نے میروں کو کھلی گالیاں دی تھیں، میر رسول بخش نے بیگم نصرت بھٹو سے جولائی ۱۹۷۷ء کے بعد ملاقات سے انکار نہ کیا۔

یہ ملاقات ذکیہ اقبال بروہی کے گھر ہوئی۔ اس کے بعد بیگم بھٹو اور بے نظیر کراچی میں میر علی احمد سے ملیں، رنجشیں دُور کر کے مصیبت کے وقت ساتھ دینے کی بات کی گئی، مگر اسی عرصے میں سابق وزیراعظم کے حوالے سے میر برادران کے خلاف ایک ایسی بات شائع ہوئی کہ مفاہمت کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند ہو گئے۔ میر علی احمد تالپور نے مرحوم بھائی سے کہا، اب کسی دوستی یا مفاہمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

میر رسول بخش کے مقامی سیاسی ہم عصروں میں مولانا عبدالقیوم کانپوری حافظ مبارک علی شاہ، قاضی محمد اکبر، غلام نبی میمن، نواب مظفر حسین اور سید وصی مظہر ندوی شامل ہیں۔ لیکن میر رسول بخش نہ تو ان اکابرین کے اندازِ سیاست سے کبھی متاثر ہوئے، نہ ان کے پیچھے چلے کسی نے حق بات کی تو اس کا ساتھ دیا اور کسی نے غلطی کی تو اسے برملا ٹوکا۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد حیدرآباد میں دس محرم کا فساد بہت سے افراد کو آج بھی یاد ہے، میر صاحب نے اس موقع پر جیل کاٹنا منظور کیا، لیکن حق بات کہنے سے باز نہ رہے۔

اکثر مذاق میں کہا کرتے تھے۔ جس حکومت نے مجھے جیل میں ڈالا سمجھ کر اس کے دن پورے ہو

گئے ہیں۔ جیل جانے والوں کو اکثر تحائف بھجواتے خواہ وہ پنڈی سازش کیس کے فیض احمد فیض ، جنرل اکبر خان یا پوشنی ہوں یا مقدمہ حیدرآباد کے ولی خان، بزنجو، مینگل اور ارباب سکندر، خود بھی جیل کے تحائف کو بہت سنبھال کر رکھتے۔ ۱۹۷۷ء کی تحریک میں قید ہو کر کراچی جیل پہنچے تو وہاں مولانا شاہ احمد نورانی نے میر صاحب کو ایک شیشی عطر کی دی۔ غالباً خس کا عطر تھا، مجھے لگا کر کہنے لگے شاہ صاحب کا تحفہ ہے، لو تم بھی فیض حاصل کرو۔

شیخ عبدالمجید سندھی کا انتقال ہوا تو نہ صرف دل سوزی کے ساتھ جنازے میں شریک ہوئے بلکہ خاصی دور تک کاندھا دیا۔ شیخ سندھی کے انتقال پر کہا یہ قوم اپنے لیڈروں کو مرنے کے بعد پہچانتی ہے۔

سنیئر وزیر ہونے کے باوجود ایک دن مقامی سینما گھر میں فلم دیکھنے آ پہنچے۔ فلم "میاں بیوی راضی" تھی اور پہلا دن تھا، لہٰذا بے پناہ رش تھا۔ مگر لوگوں کے ہجوم میں اس طرح اطمینان سے بیٹھے جیسے گلدستے میں پھول سجتا ہے۔ میں بالکل ساتھ کی نشست پر تھا، مجھے بتانے لگے کہ کسی سینما گھر میں تقریباً ۳۰ سال بعد فلم دیکھنے آیا ہوں۔

شیخ علی محمد نے میر صاحب کے لیے "شیر سندھ" لکھنے کا آغاز کیا تھا۔ یہ لقب ان کی ذات کا حصّہ بن گیا۔ گورنری چھوڑنے کے بعد جب حکومتِ وقت ان پر "خاصی مہربان" تھی تو شیخ علی محمد کو شیر سندھ لکھنے کی خاصی سزا بھگتنی پڑی۔

شورش کاشمیری نے ایک جگہ لکھا تھا۔

"میر رسول بخش تالپور اور ان کے بھائی میر علی احمد تالپور ماضی بعید کے گمشدہ اسلامی عہد کی حجازی شرافت کے مظہر ہیں۔ میر رسول بخش تو شرافت و نجابت کی جیتی جاگتی تصویر ہیں، میر صاحب کو تیر و نشتر کے اشعار اس طرح یاد ہیں، جس طرح کم بخت جوانی سینے میں ناگن کی طرح لہراتی ہو۔"

میر رسول بخش کی موت پر حضرت رئیس امروہوی نے نوحہ لکھا تھا۔

اُٹھو کہ محفلِ دنیا سے تالپور اُٹھے
اب ایسا غازیِ عزم و عمل، ملے نہ ملے
شریف دوست، عوام آشنا، ادیب نواز
رسول بخش کا نعم البدل، ملے نہ ملے

جب ایوب خاں کے خلاف مادرِ ملّت محترمہ فاطمہ جناح "شمعِ جمہوریت لے کر نکلیں تو میر صاحب

نے دیدہ و دل فرش راہ کر دیے۔ ان کے بنگلے پر اتنی بڑی لالٹین آویزاں تھی کہ میلوں سے نظر آتی تھی، ایک روایت تھی کہ میر صاحب نے جب ریڈیو سے ایوب خاں کی کامیابی کے جعلی نتائج سنے تو غصے میں ریڈیو سیٹ توڑ دیا تھا۔

مصطفےٰ کھر نے پیپلز پارٹی کے خلاف بغاوت کی تو تالپور اس سے ملنے کے لیے لاہور گئے۔ حکومت اس پر چراغ پا ہو گئی۔ کراچی ائرپورٹ پر مظاہرہ کرایا، مگر حیدرآباد اسٹیشن پر ان کے جاں نثار اکٹھے ہو گئے تو مظاہرین بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہاں میر صاحب کا والہانہ استقبال ہوا۔

میر صاحب کی عادت تھی کہ صرف دوپہر کا کھانا کھاتے اور نرم و گداز بستر کی بجائے یا تو زمین پر سوتے یا لکڑی کے تخت پر۔

میر صاحب ہمیشہ شوق سے ٹریڈ یونین کی تقاریب میں شریک ہوتے تھے۔ یکم مئی کو ہر سال مزدوروں کے کسی نہ کسی جلسے میں تقریر کرنا ان کا معمول تھا، عجب اتفاق ہے کہ مزدوروں اور کسانوں کی اس ہر دلعزیز شخصیت نے اپنی جدائی کے لئے بھی "یوم مزدور" کا انتخاب کیا اور زندگی کی جس آخری تقریب میں شرکت کی وہ بھی مزدوروں کے اسپتال کے افتتاح کی تقریب تھی جہاں ایک غم زدہ مزدور سے میر رسول بخش نے کہا۔

"بابا روتا کیوں ہے، زندگی اللہ کی امانت ہے، موت کا وقت مقرر ہے، اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔"

اپنے لیے کہا، "میں بھی دل کا مریض ہوں، تین دورے پڑ چکے ہیں مگر دیکھو اب بھی زندہ ہوں" لیکن چوتھا دورہ اسی شب کو منتظر تھا جو جان لیوا ثابت ہوا۔ یکم مئی ۱۹۸۲ء کو حیدرآباد میں ان کا جنازہ اٹھا تو میلوں تا حد نظر انسانوں کا قافلہ تھا۔ اپنے محبوب لیڈر کو الوداع کہنے کے لیے۔ صدر ضیاء الحق بھی تشریف لائے اور میر رسول بخش کے چاہنے والے عام لوگ بھی۔

مولانا ندوی کہتے ہیں میں نے اپنی ۳۳ سالہ سیاسی زندگی میں کبھی یہ سوچا بھی نہیں کہ میر رسول بخش اور حیدرآباد دو علیحدہ چیزوں کے نام ہیں۔ اس بات کا ثبوت جلوسِ جنازہ دے رہا تھا میر رسول بخش کی خواہش تھی کہ مولانا ندوی ان کی نماز جنازہ پڑھائیں اور ان کی یہ خواہش پوری ہوئی۔

میر صاحب کی موت کا تصور کرتا ہوں تو شورش کی زبان میں یہ کہنے کو دل چاہتا ہے کہ۔ ع

ہائے او موت تجھے موت ہی آئی ہوتی

یکم مئی ۸۳ء کو ٹنڈو میر محمود میں میر صاحب کی پہلی برسی کے موقع پر جو جلسہ عام ہوا اور جس سے میر علی احمد تالپور، غلام دستگیر خان، مولانا عبدالحق ربّانی، احد یوسف، غوث علی شاہ، دوست محمد فیضی اور میر رفیق تالپور نے خطاب کیا، کو ایک یادگار تقریب کہا جاسکتا ہے۔

عوامی شاعر ابراہیم منشی نے میر صاحب کی موت پر جو طویل نظم لکھی ہے اور جسے وہ عجب دل سوزی کے ساتھ پڑھتے ہیں، اس کے پہلے بول ہیں۔

میر تہ جمندا مرندا رہندا

ماڻھن جو ڈیو میر مری

یعنی میر تو پیدا ہوتے اور مرتے رہیں گے لیکن لوگوں کا میر مر گیا۔ ابراہیم منشی نے یہ نظم سنائی اور میر علی احمد تالپور نے اپنے عظیم بھائی کے لیے کہا کہ " انہیں اہل دل کے دلوں میں ہی تلاش کیا جاسکتا ہے، زمین میں نہیں ڈھونڈا جاسکتا۔" ان کا کہنا تھا کہ " میر رسول بخش تالپور نے جس کی مدد کی جس کا ساتھ دیا، کبھی یہ نہیں دیکھا کہ وہ کون ہے، کس نسل کا ہے، کیا زبان بولتا ہے اور کہاں سے آیا ہے، صرف یہ دیکھا کہ انسان ہے، ضرورت مند ہے اور مظلوم ہے، میر رسول بخش پر انسانوں کے مابین امتیاز برتنے کا الزام کوئی نہیں لگا سکتا اور ہم انشاءاللہ اس گھر پہ یہ الزام کبھی نہیں آنے دیں گے۔" غلام دستگیر خان کا خراج عقیدت بھی منفرد تھا۔ انہوں نے کہا " میری میر صاحب سے صرف چند ملاقاتوں کی دوستی تھی، کوئی گہرا تعلق نہیں تھا مگر جب انتقال کی خبر ملی تو آنسو بہہ نکلے، محسوس ہوا کہ برسوں کا تعلق تھا۔" مولانا عبدالحق ربّانی کا انداز اس سے زیادہ نرالا تھا۔ انہوں نے کہا " میر صاحب اتنا بڑا آدمی تھا کہ اس کے ایک پیر کی جوتی میں میر علی احمد کے دونوں پیر سما جائیں۔" انہوں نے بتایا کہ " ۱۹۴۸ء سے میرا میر برادران سے تعلق ہے، میں گواہی دے سکتا ہوں کہ میر رسول بخش نے سندھ کی سیاست کو وڈیروں سے آزاد کرانے کے لیے آخر دم تک جدوجہد کی۔"

میر رسول بخش تالپور کو جاننے والے لوگ اور پیپلز پارٹی کے پرانے کارکن گواہی دیتے ہیں کہ اگر ان کی ذات سامنے نہ ہوتی تو ایوب کی آمریت کے خلاف بھٹو کبھی کامیاب نہ ہوتے اور سندھ میں پیپلز پارٹی اس قدر مقبولیت حاصل نہ کرتی۔ میر رسول بخش نے میلوں کا سفر کیا، صحرا اور ریگستان چھان مارے، گاؤں اور شہر ایک کر دیے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ پیپلز پارٹی کے مخالف ہوئے اور بھٹو حکومت ان کی جان اور عزت کے درپے ہوگئی تو لوگ ان کے ساتھیوں سے پوچھتے کہ آخر اس قدر مخالفت کا سبب کیا ہے۔ ایسی کون سی بات ہے جو بھٹو اور میر رسول بخش میں نباہ نہ ہو سکا۔ میں نے اس تمام عرصے

یں میر صاحب کی شخصیت سوچ اور فکر کا جو تجزیہ کیا اُس کے سبب میں اس نتیجے پر پہنچا کہ میر صاحب نے طویل ریاضت، لگن اور محنت کے بعد ایک بُت تراشا تھا، مگر یہ بت اپنے پجاری پر ہی گر پڑا۔ باوجود "مجروح" ہونے اور "بُت پرستی" سے توبہ کرنے کے میر صاحب کو جب کبھی اپنے تراشے ہوئے پیکر کا خیال آتا، ان کا دل چاہتا کہ ہر اُس شئے سے لڑیں خواہ وہ روڑے پتھر ہوں یا مقناطیس کے ٹکڑے، جن کے سبب اس بُت کا توازن برقرار نہ رہا اور وہ اپنے تراشنے والے پر ہی آپڑا۔ ایک بار میرے دوست اور رفیق قلم ممتاز اقبال ملک جو ان دنوں افواج پاکستان کے جریدے "ہلال" راولپنڈی کے ایڈیٹر ہیں حیدرآباد آئے اور میر رسول بخش کو پتہ چلا تو انہوں نے نہائیت پُر تکلف دعوت کا اہتمام کیا، جس کی یاد میری طرح شاید ملک صاحب بھی زندگی بھر نہ بھلا سکیں۔ میر صاحب "جسارت" کے صلاح الدین کی بھی ہمیشہ تعریف کیا کرتے تھے اور ۱۹۷۰ء کے دوران کراچی جیل میں ان سے اپنی رفاقت کا تذکرہ کرتے تھے۔ مگر میں نے مرتے دم تک میر صاحب کو یہ بات بتا کر کبیدہ خاطر نہ کیا کہ جب وہ سینئر وزیر بنے اور میں نے "جسارت" میں ان کی شخصیت کے بارے میں مضمون لکھا تو محمود اعظم فاروقی نے مجھ سے تحریری جواب طلبی کی تھی کہ میں نے ایک وزیر کی ستائش میں اپنے کالم کو استعمال کیوں کیا، حالانکہ موصوف خود جنرل ضیاالحق کی چاکری کر چکے تھے۔

میر رسول بخش جب وزیر بن کر حیدرآباد آئے تو یہاں شاندار عوامی استقبال بھی ہوا اور ایک ہوٹل میں شہریوں نے استقبالیہ بھی دیا۔ تقریب میں ہر دَور کے مصاحب موجود تھے، ہر زاویے سے "جی ہاں" اور "بجا فرمایا" کے ڈونگرے برسائے جا رہے تھے۔ ایسے میں تمام لوگوں کے بیچ میر صاحب نے میرا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور کہا میری جان دُور کیوں کھڑے ہو، پھر ایک فوٹو گرافر سے کہا یار تصویر تو اُتار دے، یہ میرا "ہسٹری شیٹر" دوست ہے۔ کسی نے "ہسٹری شیٹر" پر تعجب کا اظہار کیا تو بولے بھائی جب ہم ایک ساتھ چلتے تھے تو روزانہ پولیس کے ریکارڈ میں دونوں کا نام ساتھ ساتھ درج ہوتا تھا۔

میر صاحب سے میری آخری ملاقات قاضی اکبر مرحوم کی صاحبزادی کی شادی کے موقع پر ہوئی غالباً ۲۲ اپریل تھی، میں اسی دن "جسارت" سے استعفیٰ دے کر کراچی لوٹا تھا۔ استعفیٰ پر ایک ہفتے بعد کی تاریخ درج تھی اور اتفاق سے یہ وہی تاریخ تھی جو میر صاحب کے اس جہانِ فانی سے رخصت ہونے کی تاریخ ہے۔ ۲۲ اپریل کو استعفیٰ لکھتے ہوئے مجھے بے فکری تھی کہ جب میر صاحب جیسے دوست نواز موجود ہیں تو کیا غم ہے۔ میں شادی کے پنڈال میں ملنے کے لیے گیا تو کھڑے ہو گئے، حسبِ عادت تپاک سے ملے، میں نے کہا، "میر سائیں کچھ وقت وزارت میں سے ہمارے لیے بھی نکالیں گے یا

نہیں"۔ میر صاحب بولے، "میری جان سارا وقت تمہارا ہے، آج شب کو مشاعرے (کل پاک وہند مشاعرہ) کی صدارت کرنی ہے، اس کے بعد فارغ ہیں"۔ مگر میر صاحب اس مشاعرے کے بعد کراچی گئے تو دوبارہ حیدرآباد نہ لوٹ سکے۔ آئے تو اس طرح کہ لب خاموش تھے اور نگاہیں ساکت۔ میں نے دانستہ طور پر اپنے استعفیٰ پر یوم مزدور کی تاریخ درج کی تھی اور میر صاحب نے بھی اسی دن رختِ سفر باندھ لیا۔ میں کچھ بھی نہ کہہ سکا۔

میر برادران کے دیرینہ رفیق محمد عرس سموں بیان کرتے ہیں کہ یہ میر علی احمد تالپور کی دعا کا اعجاز ہے کہ میر رسول بخش تالپور ان سے بڑے لیڈر، عوام دوست اور غریب پرور بن گئے ۴۲-۱۹۴۱ء کے زمانے کی بات ہے۔ میر علی احمد خاکساروں کی میٹنگ کر رہے تھے کہ برابر کے کمرے سے مسلسل پیانو کی آواز خلل ڈال رہی تھی۔ یہ پیانو میر رسول بخش بجا رہے تھے، جو اس وقت ایک عاشق مزاج، خوش پوش نوجوان تھے۔ کار چلانا اور دن میں چھ چھ بار لباس تبدیل کرنا جن کا مشغلہ تھا، جو موسیقی اور شکار کے شوقین تھے۔ جب میر علی احمد سے پیانو کی آواز برداشت نہ ہو سکی تو انہوں نے محمد عرس کو بھیجا کہ جا کر رسول بخش کو منع کرو۔ محمد عرس نے منع کیا تو نوجوان رسول بخش نے تنک کر جواب دیا، یہ میرا گھر ہے میں تو پیانو خوب بجاؤں گا۔ تمہیں میٹنگ کرنی ہے تو کسی اور جگہ جا کر کرو۔ محمد عرس نے یہ جواب علی احمد تالپور تک پہنچا دیا، جو چھوٹے بھائی کی عادت اور مزاج کے سبب چپ ہو رہے، لیکن جب خاکساروں کا اجلاس ختم ہوا تو میر علی احمد نے بہت دل سوزی کے ساتھ دعا مانگی کہ اے اللہ تو میرے بھائی کے دل میں قوم کا درد اور احساس پیدا کر دے، اپنے بندوں کا خدمت گار بنا دے، رئیسی کو درویشی میں بدل دے، وغیرہ وغیرہ۔

یہ دعا ایسی مقبول ہوئی کہ رسول بخش تالپور اپنے بڑے بھائی سے بڑے خاکسار بن گئے ایک بار کھدر پہنا تو ساری عمر کے لیے اسے لباس بنا لیا۔ غریبوں اور ٹھکرائے ہوئے لوگوں کے اسیر ہو کر رہ گئے۔
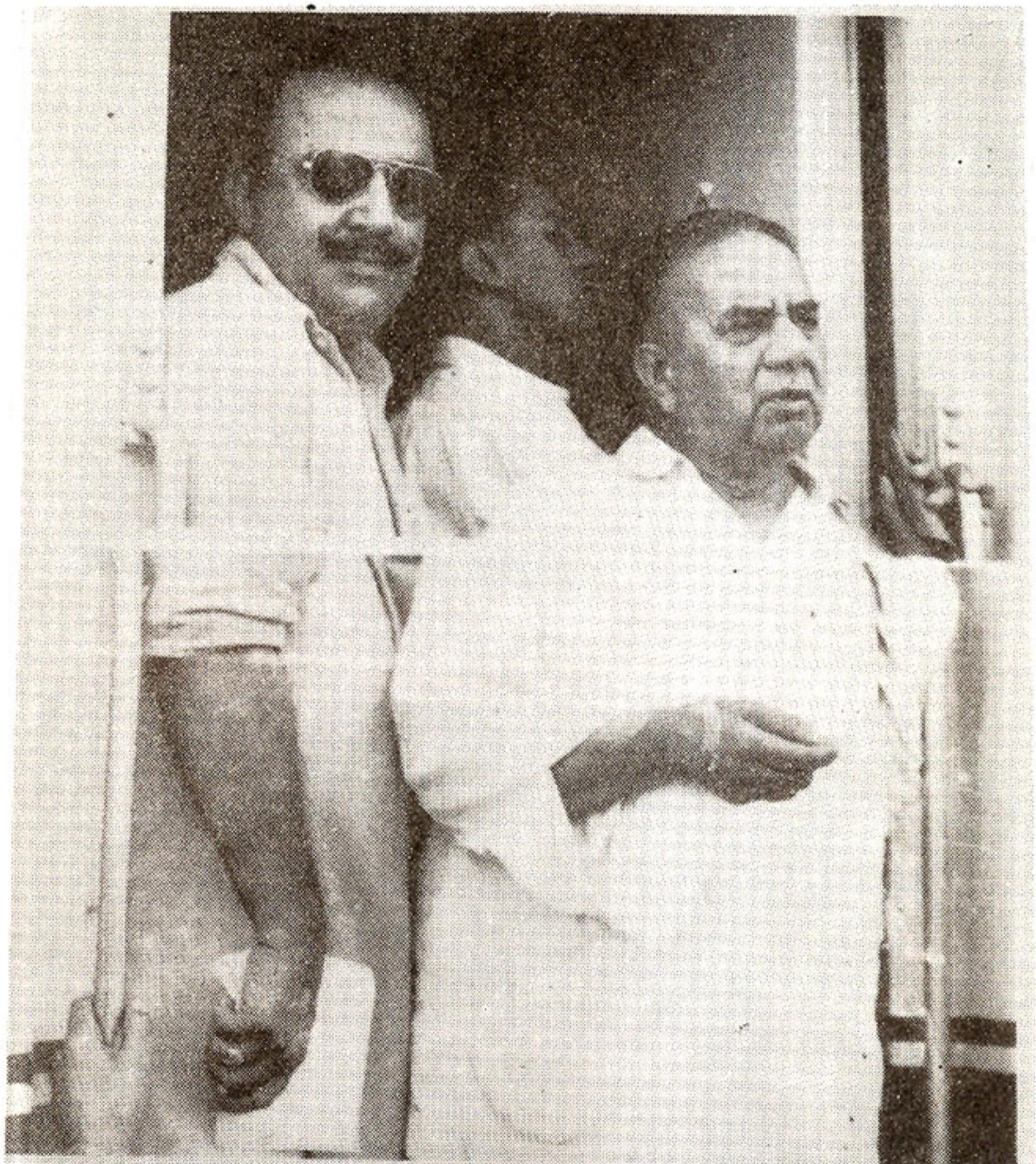
میر رسول بخش تالپور حیدرآباد ریلوے اسٹیشن پر حسین شہید سہروردی کا استقبال کرتے ہوئے میر رسول بخش اُس وقت عوامی لیگ سندھ کے صدر تھے۔
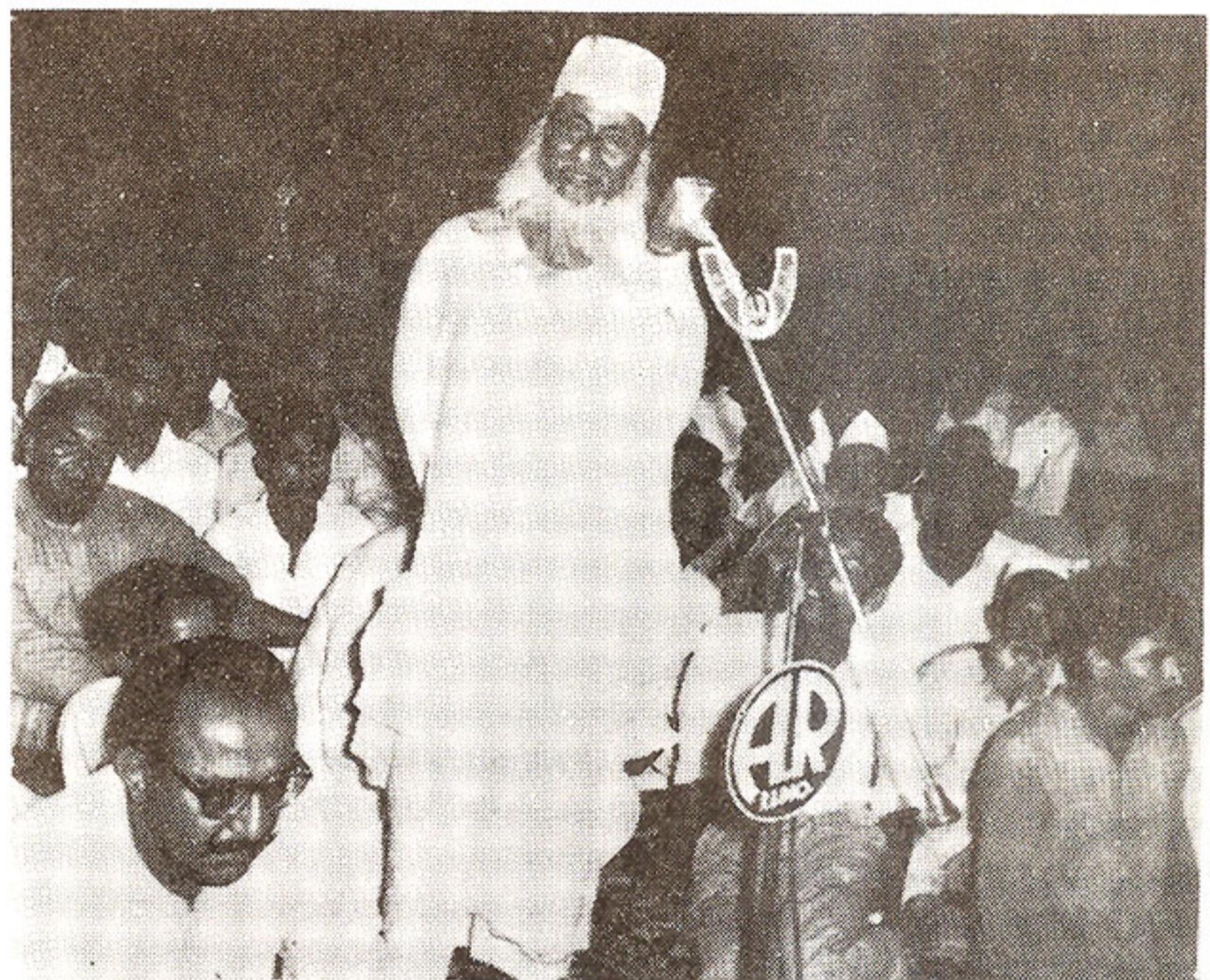
مولانا عبدالحمید بھاشانی کا خطاب ہمیر رسول بخش تالپور نمایاں ہیں
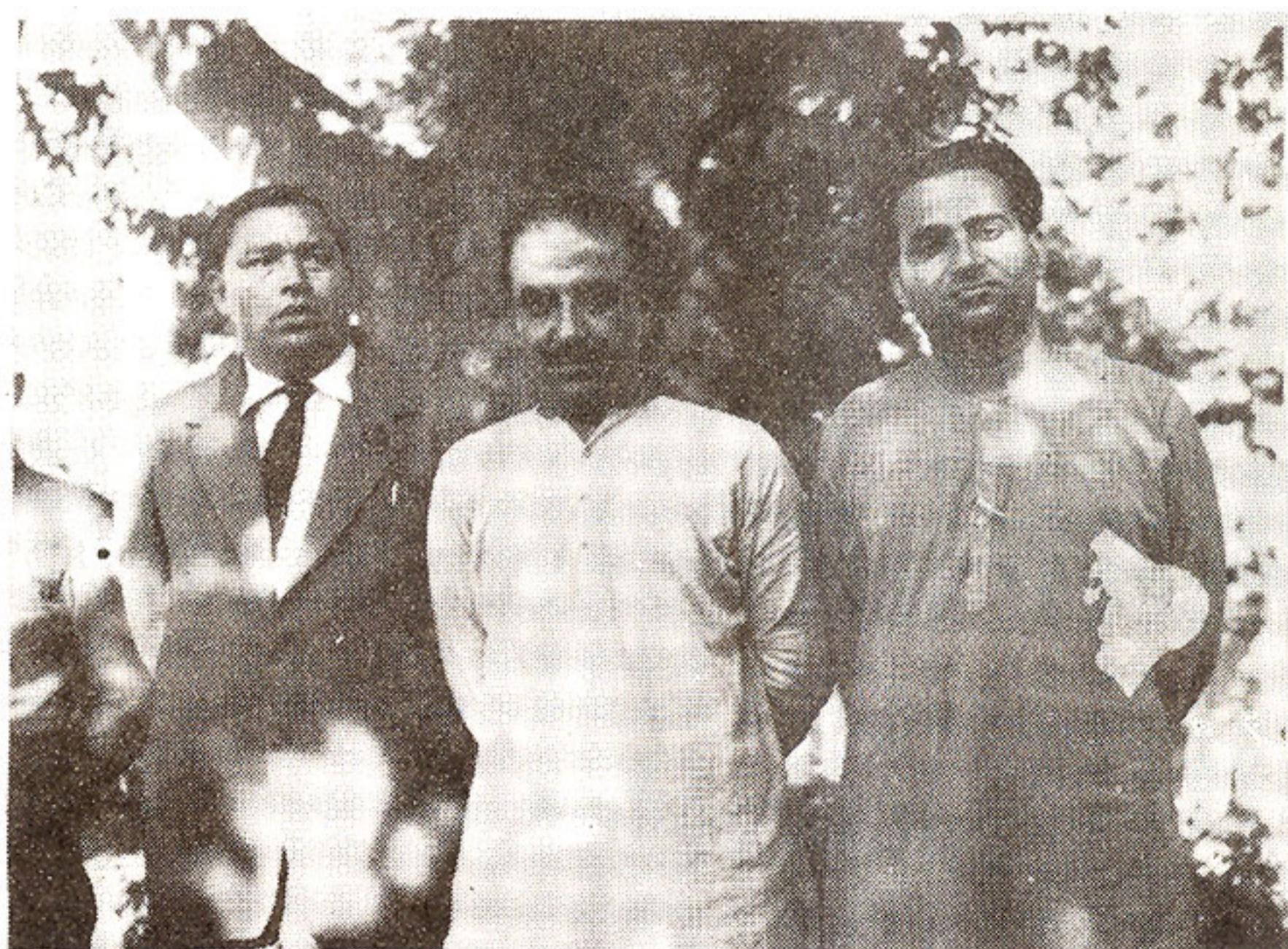
دو کامریڈوں کے درمیان ـــــــ میر رسول بخش تالپور سندھ کے ہاری لیڈر مرحوم
کامریڈ غلام محمد لغاری اور کراچی کے ممتاز رہنما محمود الحق عثمانی کے ہمراہ
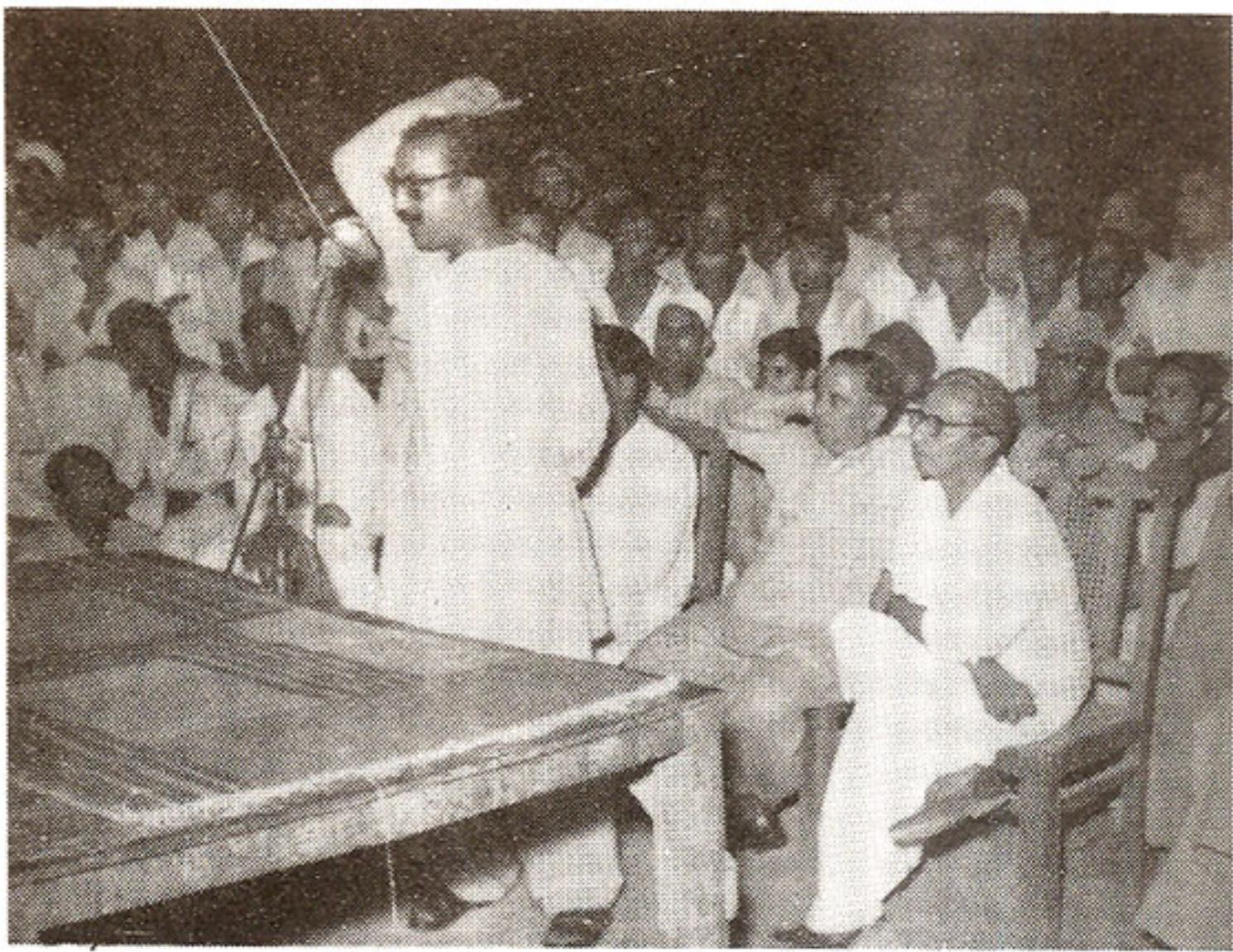
حسین شہید سہروردی کے زیرِ صدارت جلسے میں میر رسول بخش کے خطاب کا انداز
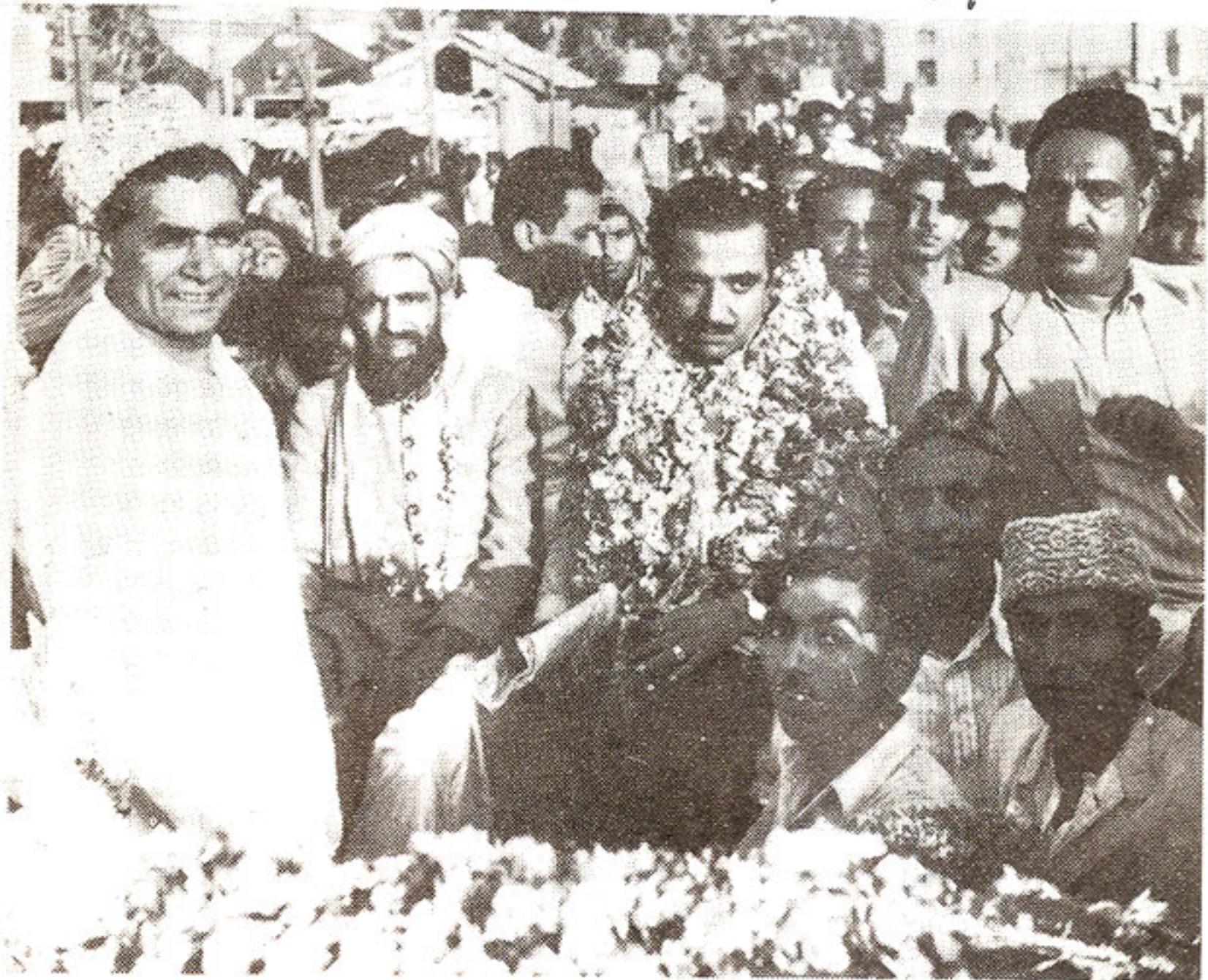
قیامِ پاکستان کے ابتدائی ایّام کی ایک یادگار تصویر، میر رسول بخش تالپور شہر سے جلوس کی صدارت میں گزر رہے ہیں۔ مولانا عبدالقیوم کانپوری، یوسف سرحدی اور غازی عبدالکریم نمایاں ہیں
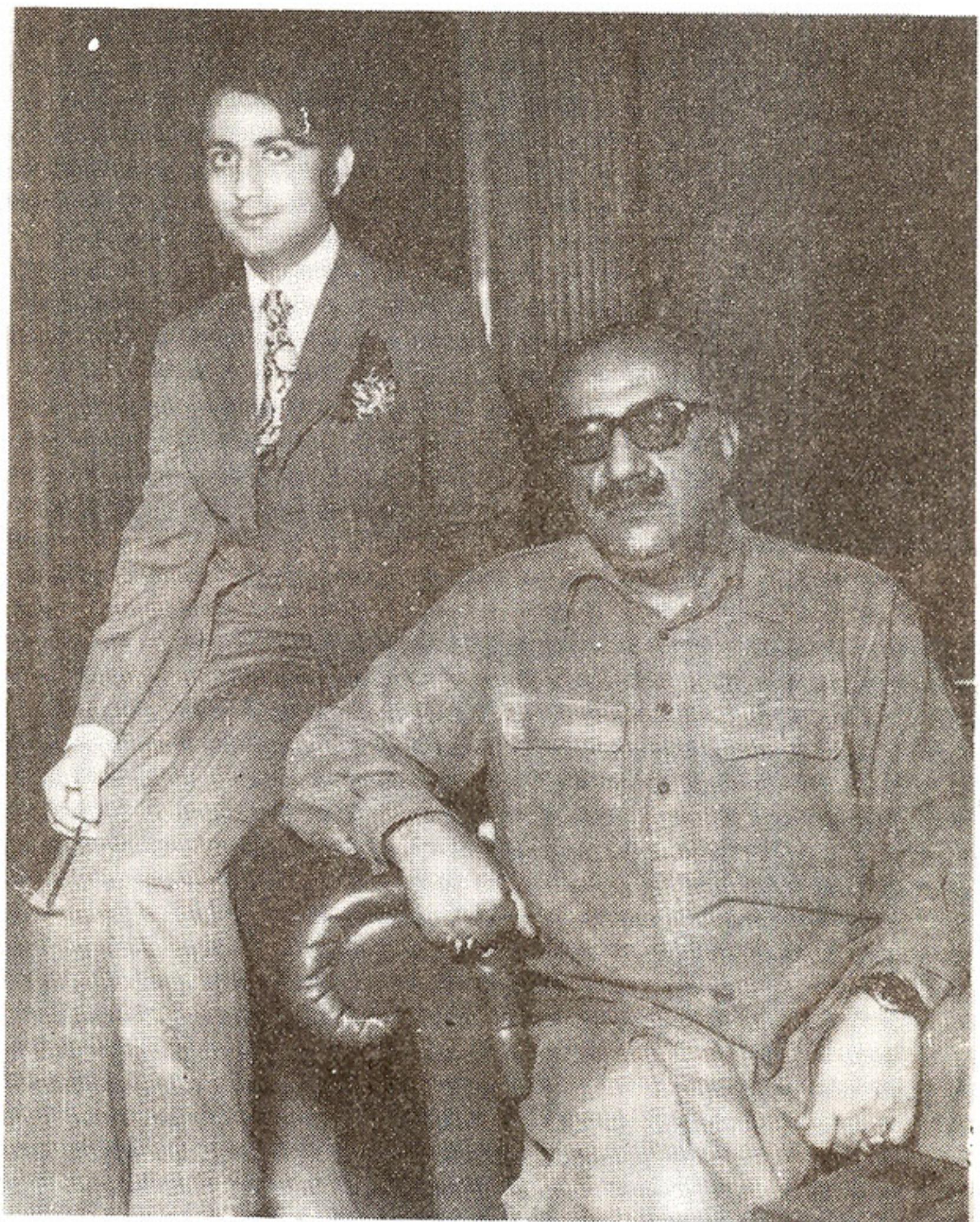
میر رسول بخش تالپور اور ان کے اکلوتے بیٹے میر رفیق تالپور

منگل کے دن گورنر ہاؤس کراچی میں میر رسول بخش تالپور اپنے استعفیٰ کا اعلان کر رہے ہیں دائیں طرف وہ قرآن پاک کو بوسہ دیکر عہد کر رہے ہیں کہ وہ اپنی تمام زندگی عوام کی فلاح و بہبود کے لئے وقف کر دیں گے

یادگار لمحہ

تالپور آج گورنر ہاؤس خالی کر دینگے

کراچی ۱۳ فروری (اسٹاف رپورٹر) گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور نے آج سہ پہر استعفےٰ دینے سے قبل ہی گورنر ہاؤس خالی کرنے کی تیاریاں کر لی تھیں۔ ان کے خاندان کے افراد پہلے ہی گورنر ہاؤس سے چلے گئے ہیں اور بیشتر سامان بھی شام تک گورنر ہاؤس سے جا چکا تھا کل صبح وہ تنہا گورنر ہاؤس چھوڑ دیں گے۔ آج اپنی پریس کانفرنس میں انہوں نے گورنر ہاؤس کو سیاسی کوڑے سے تعبیر کیا اور کہا کہ وہ کل اسے خالی کر دیں گے پریس کانفرنس میں گورنر تالپور کا لہجہ انتہائی جذباتی تھا اور ان کی آواز کئی بار بھرا گئی۔ ایک مرتبہ انہوں نے انتہائی جوش میں کہا کہ عزت بھی کوئی چیز ہوتی ہے، بڑے بھائی باپ کی جگہ ہوتے ہیں۔ انہوں نے میرے باپ کی توہین کی ہے۔ جب اخباری نمائندے سوالات کرنے کے بعد خاموش ہو گئے تو انہوں نے کہا کہ اور سوال کیجئے لیکن اخباری نمائندوں نے ان سے کہا کہ اب آئندہ کے لئے رکھئے۔

۱۷ اکتوبر ۱۹۷۵ء کا وہ تاریخی لمحہ جب میر رسول بخش تالپور نے پریس کانفرنس میں پیپلز پارٹی چھوڑنے کا اعلان کیا۔

میر رسول بخش تالپور سندھ کے وزیر کی حیثیت سے خیر پور کے ایک گاؤں
میں پیر آف رانی پور سید ادھل شاہ جیلانی اور غلام عباس جھنبرو کے ہمراہ
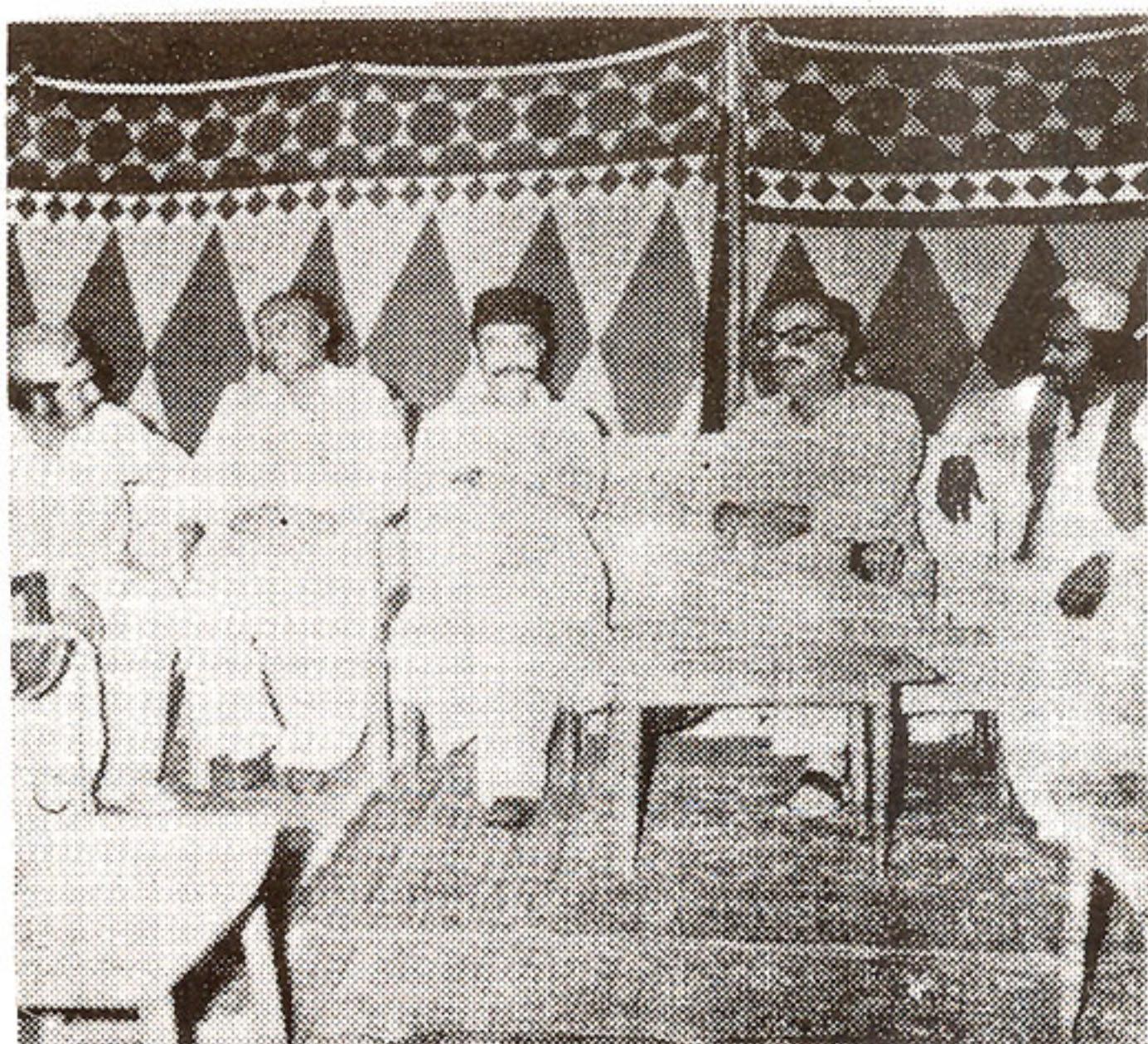
میر رسول بخش تالپور ایک اور دعوت میں میر علی احمد تالپور
اور اپنے دوست شیخ علی محمد ایڈیٹر "آفتاب" کے ہمراہ

خیرپور میں میر رُسول بخش تالپور استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے
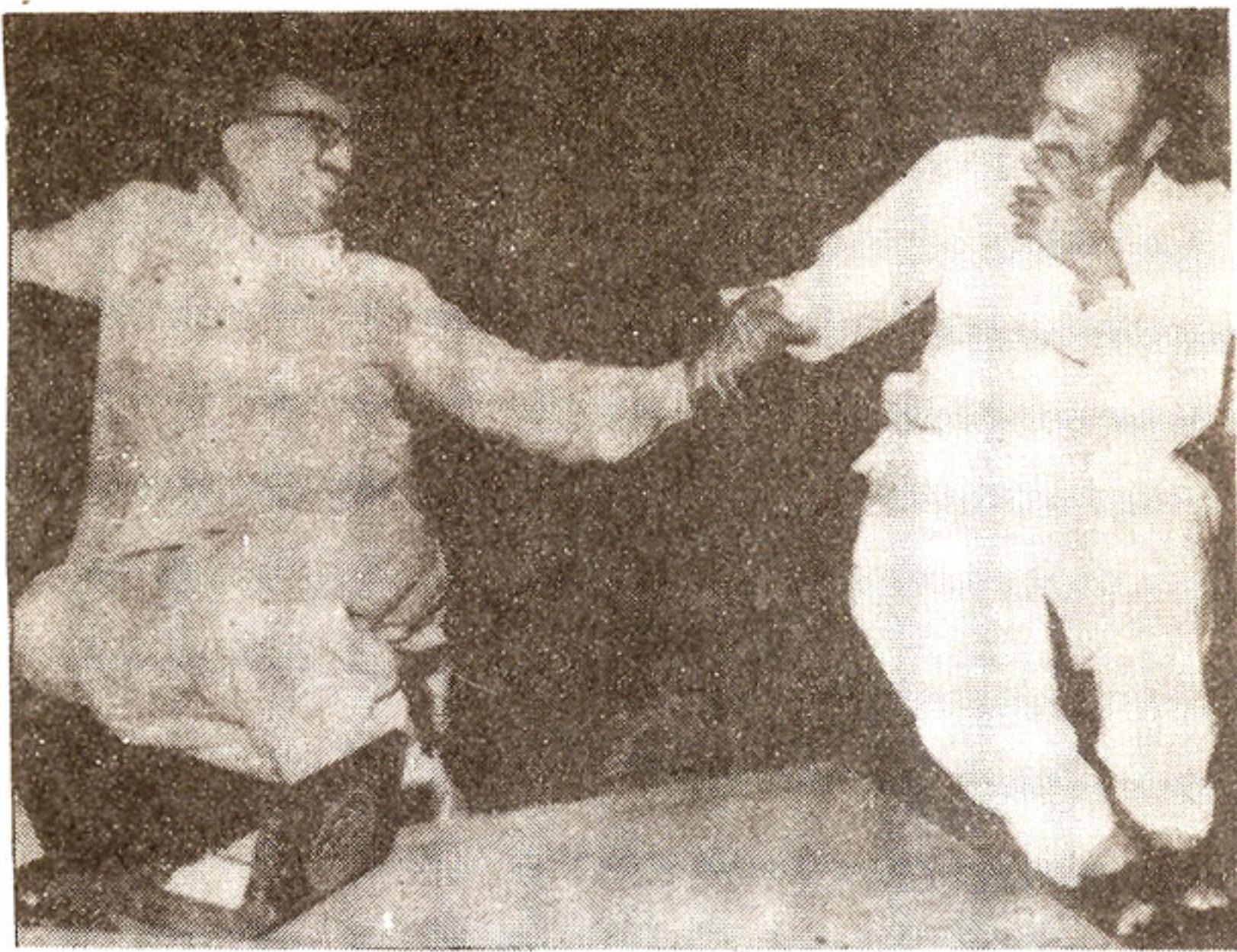
میر رسول بخش تالپور سے ممتاز بھٹو کی ملاقات اس طرح بھی ہوا کرتی تھی۔
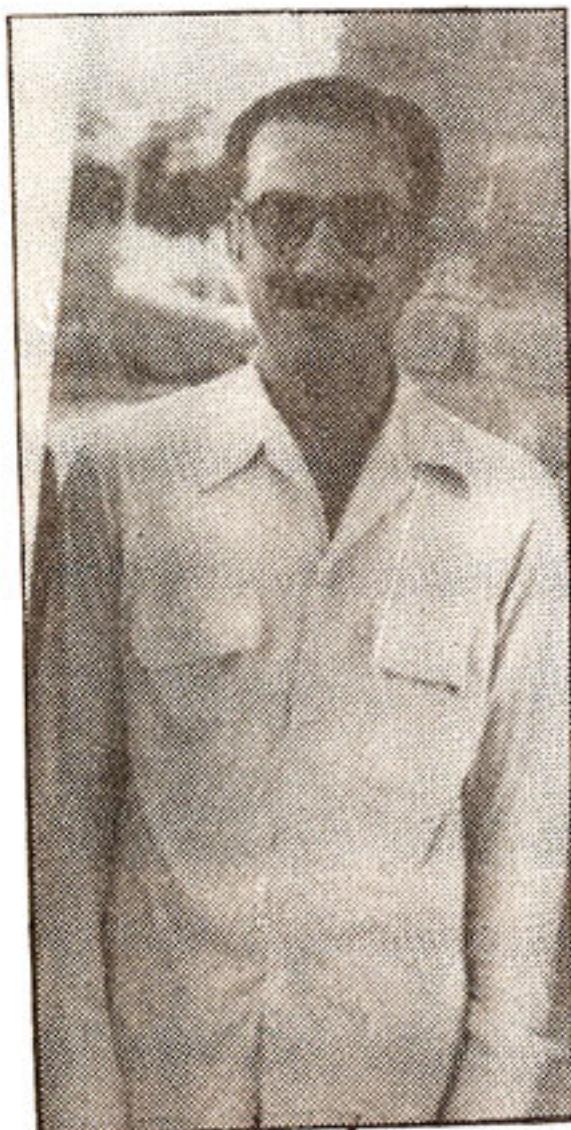
قیامِ پاکستان سے قبل کے
خوش پوش میر رسول بخش تالپور

میر رسول بخش اور عرفان ملک دو ساتھی ۔ ایک تحریک

میر رسول بخش اور میر علی احمد تالپور کراچی کی ایک دعوت میں احباب کے ہمراہ -
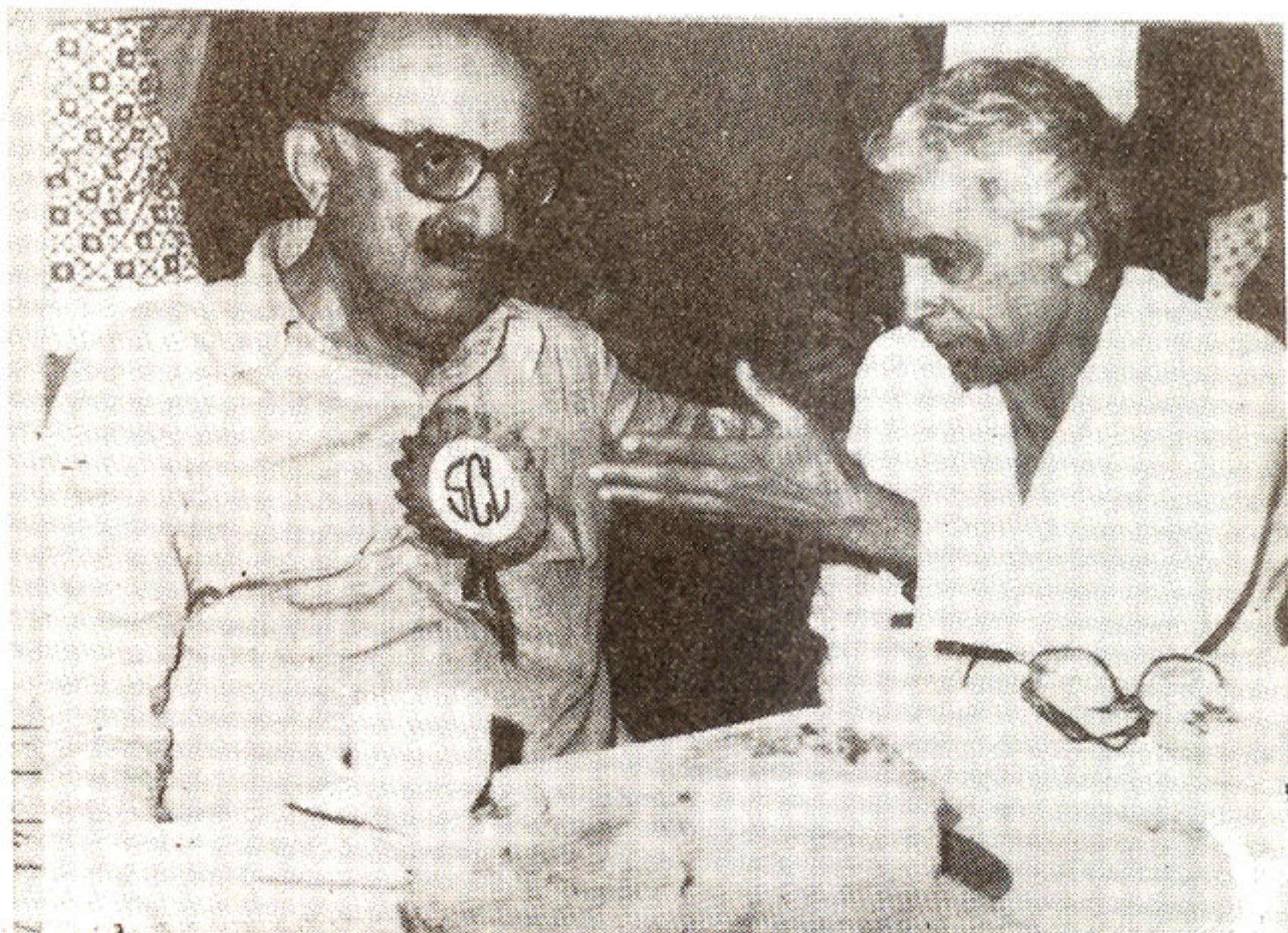
میر رسول بخش تالپور حیدرآباد میں "جنگ" کے سابق نمائندے اقبال حامد کے ہمراہ

میر رسول بخش تالپور اور مصنفؒ یہ تصویر فوٹوگرافر شجاع الدین شیخ نے میر صاحب کی فرمائش پر
اُس استقبالیے میں اُتاری جو انہیں سندھ کا سینیئر وزیر بننے پر اہلِ حیدرآباد نے دیا
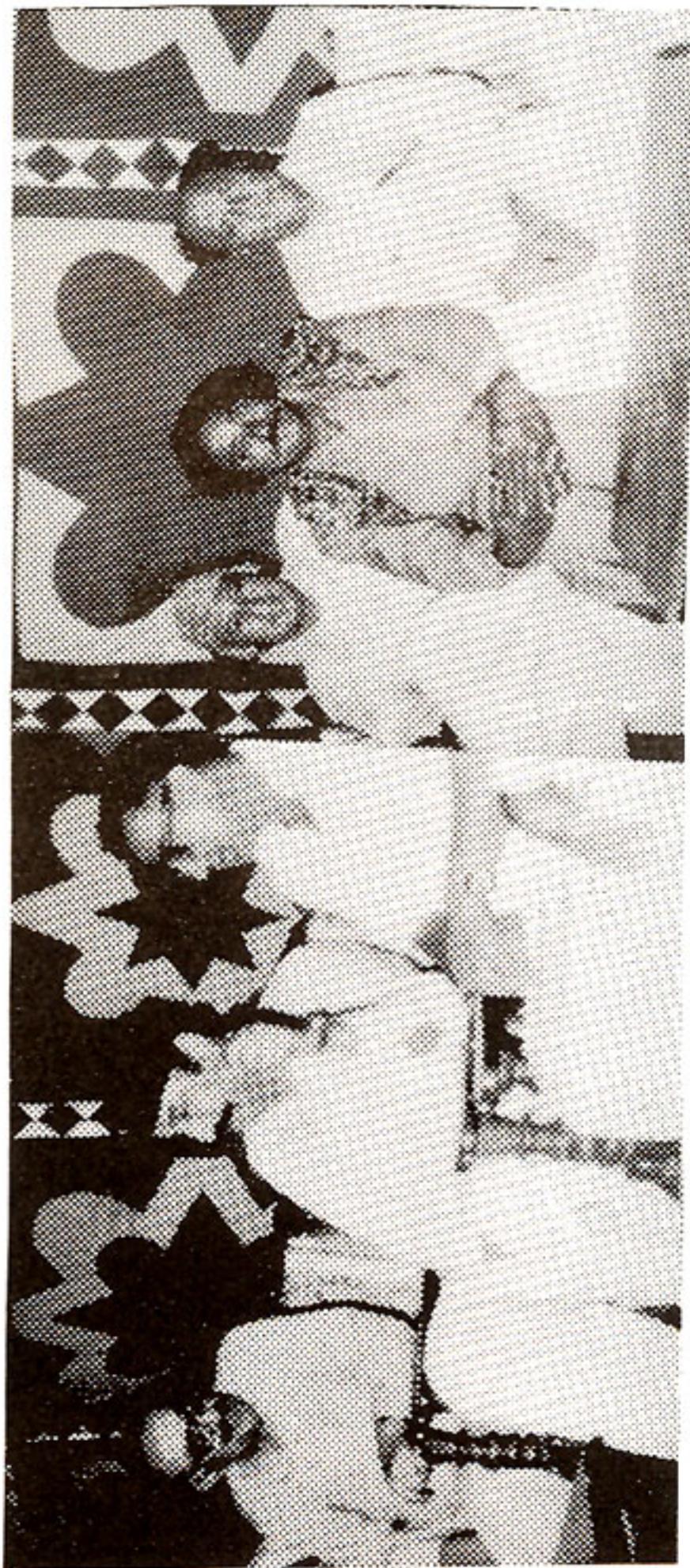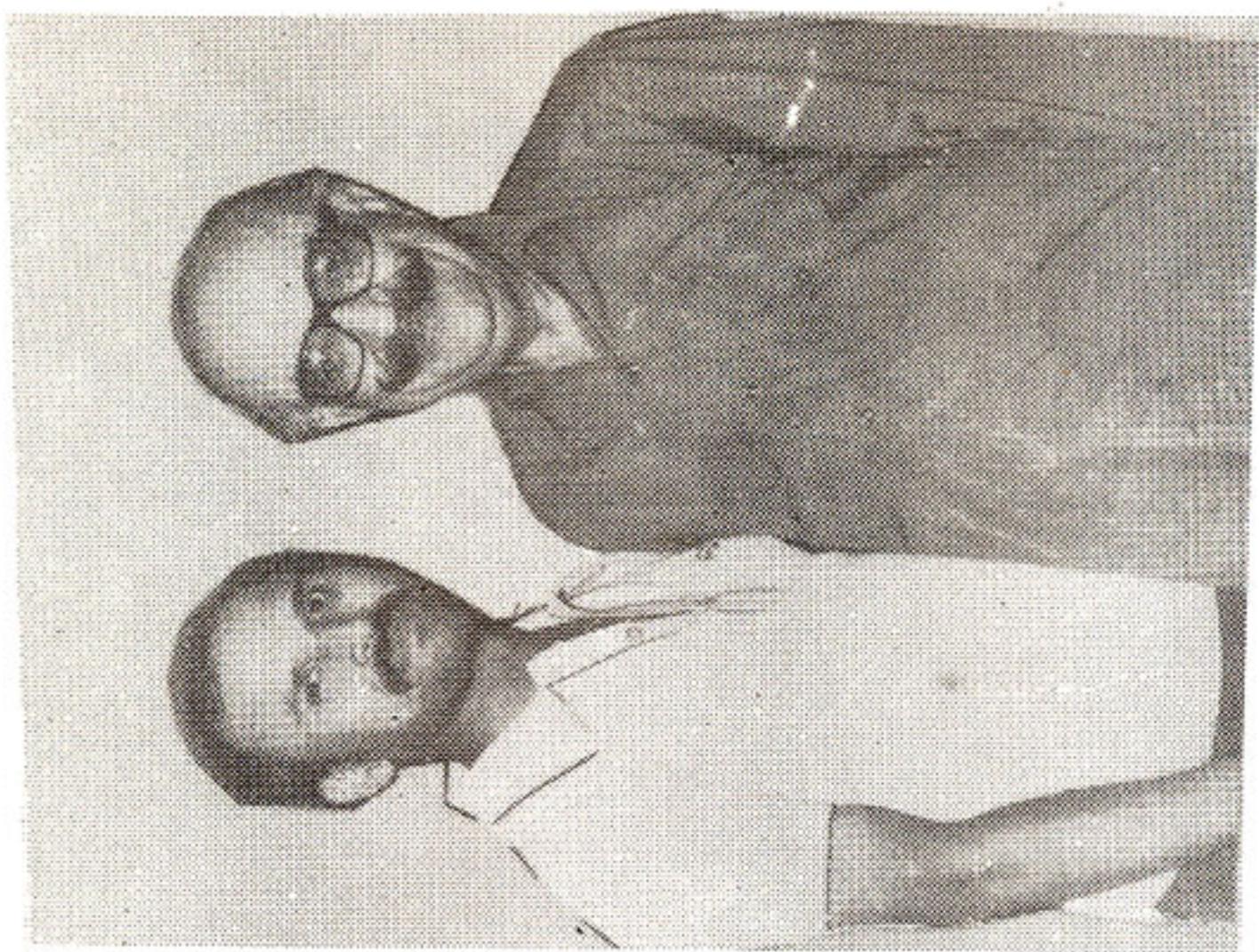
میر رسول بخش تالپور ایک دعوت میں اپنے بڑے بھائی
میر علی احمد تالپور عوامی شاعر ابراہیم منشی شیخ علی محمدؒ اور دیگر کے ہمراہ
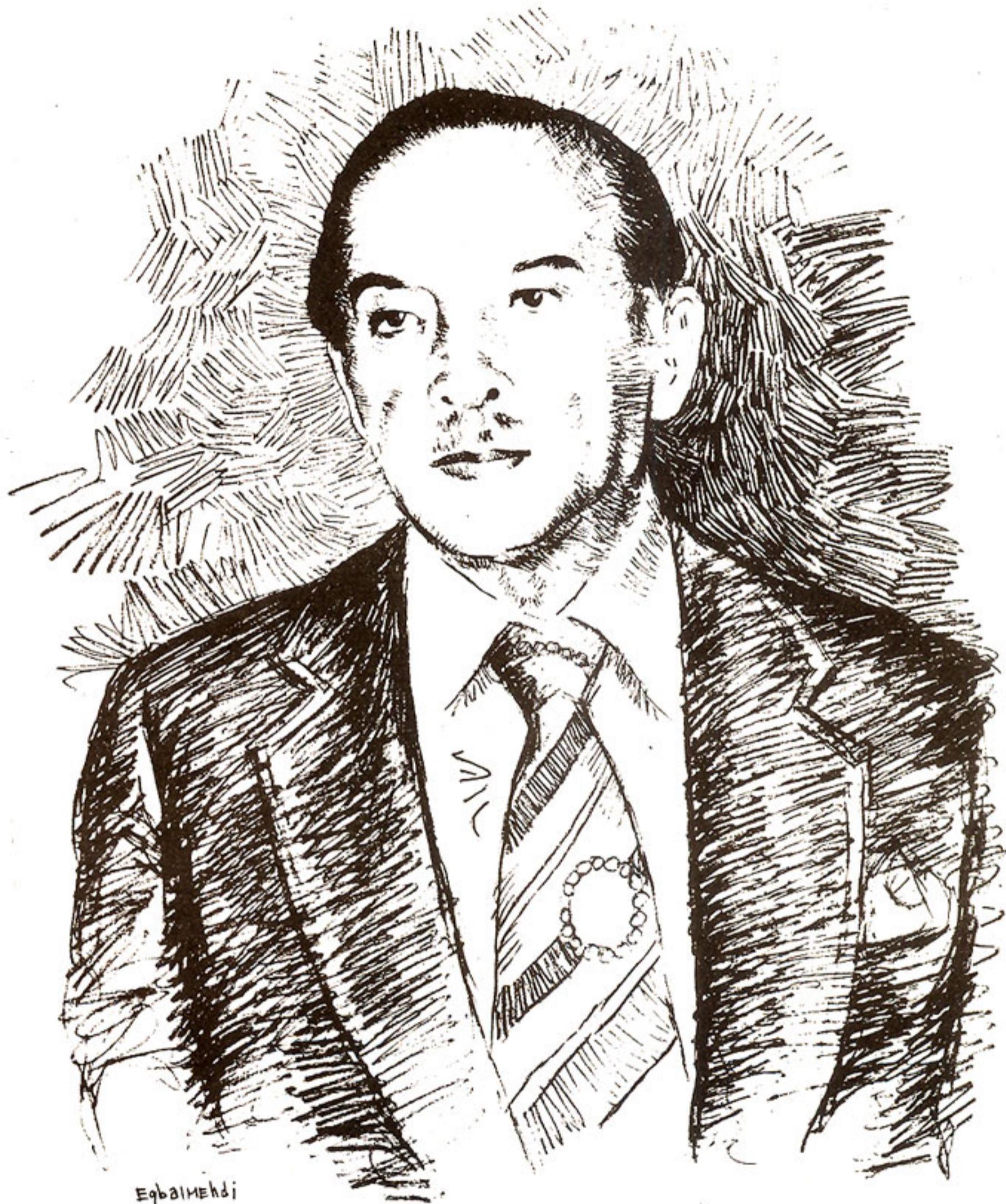
اکتوبر ۱۹۱۰ء سہون شریف دادو

۱۳، فروری ۱۹۷۹ء حیدرآباد

قاضی محمدّ اکبر

قاضی محمدؒ اکبر کے سیاسی تعارف کے لیے بس یہ ایک جملہ ہی کافی ہے کہ انہوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے سندھ میں جی ایم سیّد جیسے سندھی قوم پرست لیڈر کو اسمبلی کے انتخاب میں شکست دی تھی۔

لیکن قاضی محمدؒ اکبر کی ہنگامہ خیز زندگی کا احاطہ شاید یہ بھر پور جملہ بھی نہ کر سکے، حالانکہ یہ اتنا بڑا اعزاز ہے جسے سندھ کی تاریخ ہمیشہ محفوظ رکھے گی

میں نے اپریل ۱۹۷۸ء میں قاضی صاحب سے ایک طویل انٹرویو کیا جو ۷ اپریل ۱۹۷۸ء کے "جسارت" میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو میں قاضی صاحب کا تعارف میں نے ان الفاظ میں پیش کیا تھا:

"قائداعظم محمدؒ علی جناح کی دعاؤں کے ساتھ جی ایم سیّد کے مقابلے میں سندھ اسمبلی کا الیکشن جیتنے والا کل کا نوجوان وادیٔ سیاست کے مختلف نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد آج عمر رفتہ کو آواز دے رہا ہے۔ یہ نوجوان بزرگ سیاست دانوں کی فہرست میں نام لکھوانے کے بعد اب سندھی اخبار "سندھ نیوز" کا مدیرِ منتظم ہے۔ قاضی محمدؒ اکبر اپنے جوان بیٹے سلیم کی اندوہناک موت کے بعد خود کو اس اخبار کی دیکھ بھال تک محدود کر چکے ہیں جو ان کے بیٹے کی تمنّا اور آرزو تھی۔

قاضی محمدؒ اکبر کو مبصّرین نے مختلف مواقع پر "سندھ کا دولتانہ" بھی کہا ہے۔ قاضی اکبر نے عروج و زوال کی بہت سی منزلیں سر کیں۔ وہ جب ۲۱ سال کی عمر میں حیدر آباد

میونسپلٹی کے نائب صدر بنے تو وہ ۱۹۳۱ء کا سن تھا اور ان کی سیاسی اور سماجی زندگی کا آغاز۔ ۲۱ سال کا نوجوان جب حیدرآباد میونسپلٹی کا نائب صدر تھا تو اس کے اُستاد ممبر کی حیثیت سے اس کے سامنے بیٹھتے تھے۔ قاضی اکبر نے ۲۳ سال کی عمر میں خاکسار تحریک میں شمولیت اختیار کی اور ۱۹۳۵ء تک علامہ مشرقی کے پیرو کار رہے۔ اس عرصے میں وہ سالار صوبہ سندھ بنے اور ہندوستان کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ وہ ہندوستان کو بذریعہ جہاد آزاد کرانے کے جذبے سے خاکسار تحریک میں شامل ہوئے تھے۔

۱۹۳۵ء میں انہوں نے مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کی اور اسی سال میونسپلٹی کے صدر چُنے گئے۔ جب ۱۹۴۶ء میں وہ جی ایم سیّد کو شکست دے کر اسمبلی میں پہنچے تو چیف پارلیمنٹری سیکرٹری بنائے گئے۔ ۱۹۵۲ء میں انہیں کنٹونمنٹ بورڈ کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اسی سال انہوں نے میونسپلٹی کی صدارت کے الیکشن میں میر رسول بخش تالپور کو شکست دی۔ ۱۹۵۳ء میں انہیں دوبارہ سندھ اسمبلی کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۵۵ء میں وزارت میں لیا گیا اور تعلیم، خزانہ اور اطلاعات اور بعد میں داخلہ کے قلمدان سُپرد کئے گئے۔ وزیرِ اطلاعات کی حیثیت سے انہوں نے حیدرآباد میں اے پی پی کی سروس شروع کرائی اور تین اخباروں کو حکومت کی طرف سے اے پی پی کی مُفت سُہولت دلوائی۔ مسلم ایجوکیشن سوسائٹی کے سیکرٹری اور چیئرمین کی حیثیت سے تعلیم کے فروغ کے لیے کام کیا اور چیمبر آف کامرس کا آغاز کیا۔ بعد ازاں انہیں مسلم لیگ کی مرکزی مجلسِ عاملہ کا ممبر منتخب کیا گیا۔ سردار نشتر کے دور میں انہوں نے آل پاکستان مسلم لیگ نیشنل گارڈ کے صدر کی حیثیت سے سارے پاکستان کا دورہ کیا۔

قاضی اکبر نے ۱۹۶۹ء میں ایوب خان کی طرف سے گول میز کانفرنس میں شرکت کی۔ ۱۹۷۰ء کے انتخابات میں انہیں پیپلز پارٹی کے اُمیدوار کے مقابلے میں شکست ہوئی۔ چند سال بعد انہوں نے پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کر لی اور انہیں پرتگال میں پاکستان کا سفیر بنا دیا گیا۔ قاضی اکبر نے گزشتہ دنوں سندھ مسلم لیگ کے کنونشن میں شرکت کی تو پیر پگاڑو نے ان کے بارے میں کہا کہ وہ مسلم لیگ میں ہیں اور رہیں گے۔ اس طرح پتہ چلا کہ وہ لوٹ کر گھر واپس آ گئے ہیں۔ قاضی اکبر جیسے مسلم لیگیوں کے لیے مسلم لیگ گھر بھی ہے اور جائے امان بھی"۔

اس انٹرویو کے دوران قاضی صاحب مجھ سے مسلسل یہ کہتے رہے کہ ایک انٹرویو سے بات نہیں بنے گی۔ بہتر ہوگا کہ تم بیٹھ جاؤ اور پوری داستانِ حیات کتاب کی صورت میں مرتّب کرلو، نصف صدی کا قصّہ ہے، دو چار برس کی بات نہیں، بہت سی باتیں اور واقعات ابھی حافظہ میں ہیں۔

لیکن میں سندھ کے اس عظیم سیاستدان کی پیش کش کو وقت کی بے وفائی سے نہ پرکھ سکا اور وقت مجھے دھوکا دے گیا۔

متذکرہ انٹرویو میں میرے اس سوال کے جواب میں کہ جب ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قرارداد پاس ہوئی اور پاکستان کا واضح مطالبہ کیا گیا، اس وقت مسلم لیگ میں آپ کی حیثیت کیا تھی اور سندھ کے مسلمانوں نے مطالبۂ پاکستان کو کس حد تک اپنایا تھا؟

قاضی اکبر نے پُرانی یادوں کے دریا کو کوزے میں یوں بند کیا تھا۔

"میں ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ نیشنل گارڈ ضلع حیدرآباد کا سالار تھا لیکن سندھ کے مسلمانوں میں پاکستان کے حصول کے شعور کی بات ہے تو اس کا مختصر الفاظ میں احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ یہ تاریخی حقیقت ہے کہ سندھ کے مسلمان مطالبۂ پاکستان میں دوسرے خطّے کے مسلمانوں سے کہیں آگے تھے۔ علیحدہ وطن کے لیے ۱۹۴۰ء کی قرارداد سے قبل ۱۹۳۸ء میں کراچی میں آل انڈیا مسلم لیگ کی جو کانفرنس ہوئی اور جس کے انعقاد کے لیے شیخ عبدالمجید سندھی اور جی ایم سیّد وغیرہ نے نہایت سرگرمی سے کام کیا اور جس میں مجھے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے کام کرنے کا موقع ملا، واضح طور پر قرارداد کے ذریعے علیحدہ وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں سندھ کے خصوصی اور برّصغیر کے دوسرے مسلم خطوں کے عمومی حالات کا جائزہ لیا گیا تھا۔ اس قرارداد میں "لفظ پاکستان" اگرچہ استعمال نہیں ہوا مگر سندھ کے مسلمانوں کی کسمپرسی کا جائزہ لیتے ہوئے آزاد وطن کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ برّصغیر کی آزادی کی جتنی تحریکیں چلیں، سندھ کے عوام نے ان میں بھرپور کردار ادا کیا۔ دوسری جنگِ عظیم کے وقت جب انگریز کی حکومت کمزور پڑ رہی تھی، مولانا عبیداللہ سندھی اور شیخ عبدالرحیم سندھی جیسے جیّد عالم اور زعما چاہتے تھے کہ افغانستان کے حکمرانوں کو برّصغیر کی آزادی کے لیے انگریزوں کے خلاف جہاد پر آمادہ کیا جائے تاکہ ایک

جانب برِّصغیر کے مسلمانوں کو آزادی ملے، دوسری جانب ترکی پر سے انگریزوں کا دباؤ کم ہو۔ اس تحریک کو برِّصغیر کی تاریخ میں ریشمی رومال کی تحریک کہا گیا ہے۔ اس تحریک میں مرکزی کردار خطۂ سندھ نے ادا کیا۔ اس تحریک میں میرے والد قاضی عبدالقیوم میرے تایا حکیم فتح محمدؒ، رئیس غلام محمد بھرگڑی، پیر صاحب جھنڈا شریف اور مولانا امروٹی نے بھرپور حصّہ لیا۔ بے شمار لوگوں نے قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں اور عزم و ہمّت کی ایسی داستان رقم کی جو آج کے نوجوانوں کو سُنائی جائے تو ان پر اپنے اسلاف کی بلند کرداری کا راز کھُلے۔ اس تحریک میں میرے والد اور تایا نے بھی بھرگڑی صاحب کے ساتھ ایک سال تک جیل کاٹی۔

ریشمی رومال کی تحریک کے بعد خلافت تحریک کا غلغلہ بلند ہوا، کراچی سے حاجی عبداللہ ہارون، شیخ عبدالمجید سندھی، مولانا دین محمدؒ وفائی اور میر محمدؒ بلوچ، حیدرآباد سے عبدالجبار وکیل، سکھر سے نعمت اللہ قریشی، مٹیاری سے پیر غلام مجدد سرہندی، نواب شاہ سے حکیم مولوی محمدؒ معاذ اور شکارپور سے مولوی عبدالکریم چشتی، اس تحریک کے رہنماؤں میں سے تھے۔ اگرچہ برِّصغیر کے مشہور مسلم زعماء مولانا محمدؒ علی اور مولانا شوکت علی، خلافت تحریک کے روحِ رواں تھے لیکن یہ تحریک سندھ کے چپّے چپّے میں جس طرح پھیلی شاید ہی کسی اور جگہ پھیلی ہو۔ خلافت تحریک کے بعد ہجرت تحریک کا زمانہ پُرانے لوگوں کو اب تک یاد ہوگا۔ اس تحریک کا مرکز لاڑکانہ تھا جہاں کے بیرسٹر جونیجو اور ڈاکٹر شیخ نور محمدؒ کی قیادت میں ہزاروں افراد نے سندھ سے افغانستان کی طرف ہجرت کی۔ اس ہجرت کی بنیاد یہ جذبہ تھا کہ انگریزوں کے زیرِ تسلّط علاقہ دارالکفر ہے لہٰذا کسی ایسی سرزمین پر چلنا چاہیئے جہاں خُدا کے سوا کسی کی حکمرانی قبول نہ کرنی پڑے۔ اس تحریک میں تقریباً پندرہ ہزار افراد نے ہجرت کی۔ اس تحریک میں کارفرما جذبہ سے سندھ کے عوام کی حرّیت پسندی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

ہجرت تحریک کے بعد ۱۹۴۲ء میں حُر تحریک کا آغاز ہوا اور پیر صبغت اللہ شاہ کی زیرِ قیادت حرُوں نے انگریزوں کے خلاف مسلح بغاوت کی۔

ان تمام تحریکوں سے پہلے بھی سندھ میں ایک تحریک چلی تھی اور اسے حُر تحریک کہا جاتا ہے۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب انگریز کے خلاف آزادی کا نعرہ بلند

کرنے کا سوچا بھی نہ جا سکتا تھا، برّصغیر میں اس تحریک کے قائد سیّد احمد شہید بریلوی تھے جب کہ سرحد اور افغانستان کے مسلمانوں کی رہنمائی شاہ اسماعیل شہید بریلوی کر رہے تھے، اور سندھ میں موجودہ پیر صاحب پگاڑو کے پردادا اس تحریک کے معاون تھے۔ انہوں نے سیّد احمد شہید بریلوی کی درخواست پر حُر مجاہدین کے دستے انگریزوں کے خلاف لڑنے کے لیے بھیجے۔ یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ پیر صاحب کے مریدوں میں اس تحریک سے پہلے "حُر" کا لفظ مروج نہ تھا۔ موجودہ پیر صاحب کے پردادا نے جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا تو اپنے مریدوں سے نئے سرے سے بیعت لی اور بیعت کرنے والوں کو انگریزوں کے خلاف لڑنے کے مقاصد سے آگاہ کرتے ہوئے انہیں "حُر" کا خطاب دیا۔ یہ اسی تحریک کا اثر تھا کہ ۱۹۴۲ء میں حُروں نے مسلّح بغاوت کی اور موجودہ پیر صاحب کے والد نے جامِ شہادت نوش کیا۔ حُروں کی اس بغاوت کی پورے برّصغیر کی تاریخ میں نظیر ملنی مشکل ہے۔ ان تحریکوں کے تذکرے اور پس منظر میں یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ۱۹۴۰ء کی قرارداد سندھ کے مسلمانوں کے جذبات کے عین مطابق تھی۔ وہ یکایک اس مقام تک نہیں پہنچے، انہوں نے اپنے سینکڑوں زعماء کے ساتھ اس منزل کا سفر طے کیا۔ ان ہی تحریکوں کے درمیان ایک اور اہم واقعہ تاریخ کے صفحات پر نقش ہے۔ یہ ایک واقعہ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی ہے ہندوستان میں مدراس اور بمبئی صرف دو پریذیڈنسی تھیں۔ بمبئی کے ساتھ رہنے سے سندھ کو جو نقصانات تھے، مسلمانوں نے اس کا پوری طرح اندازہ کر لیا تھا۔ لہٰذا سندھ کے مسلمانوں نے قائداعظم اور آغا خان کی قیادت اور رہنمائی میں بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کی تحریک چلائی۔ یہ ۱۹۳۴ء کا زمانہ تھا اور پاکستان کی جدوجہد ابھی دُور تھی لیکن سندھ میں اس تحریک کے ذریعے قیامِ پاکستان کی راہ ہموار ہوئی۔ ہندو تسلّط اور استحصال کے خلاف یہ کھُلا احتجاج برّصغیر میں دو قومی نظریے کو منوانے کی طرف مارچ کا آغاز تھا۔ دُور رس اور دُوربین نگاہوں نے اسی زمانے میں دیکھ لیا تھا کہ مستقبل کا خاکہ کیا ہوگا۔"

قاضی اکبر نے قائداعظم سے اپنی ملاقاتوں کا احوال سُناتے ہوئے کہا تھا:

"مُیں نے قائداعظم سے پہلی ملاقات ۱۹۳۸ء میں کی۔ یہ ملاقات یکطرفہ تھی۔ میں ہزاروں دوسرے ادنیٰ کارکنوں کی طرح کراچی کے اجلاس میں قائداعظم کو دُور سے

دیکھتا اور خوش ہوتا رہا۔ یہاں میں نے وہ سب تقاریر سُنیں جو برّصغیر کے مسلم زعمائے قائد کی موجودگی میں کیں۔ بہادر یار جنگ آخری مقرّر تھے۔ مجھے ان کی وہ تاریخی دُعا بھی یاد ہے جو انہوں نے قائد کی درازی عمر کے لیے مانگی۔ اس کے بعد سندھ گیر سطح پر میری سیاسی زندگی کا آغاز ۱۹۴۵ء سے ہوا۔ جب مجھے سندھ مسلم لیگ نیشنل گارڈ کا سالار بنایا گیا۔ یہی وہ دور تھا جب سندھ میں مسلم لیگ کے سرگرم حامی جی ایم سیّد نے قائداعظم سے اختلاف کیا۔ اس وقت سندھ کے وزیر اعلیٰ سر غلام حسین تھے جب کہ کابینہ میں ایوب کھوڑو، پیر الٰہی بخش اور میر غلام علی تالپور شامل تھے۔ یہ حکومت بھی اگرچہ مسلم لیگ کی تھی لیکن حکومتی عہدوں پر فائز مسلم لیگیوں کی مسلم لیگ کے عہدیداروں سے نہ نبھ سکی۔ جی ایم سیّد اس وقت سندھ مسلم لیگ کے صدر تھے۔ جب الیکشن کا موقعہ آیا تو یہ مسلم لیگی اسی طرح اُلجھ پڑے، جس طرح چند نشستوں پر آج کل پی این اے والے اُلجھ پڑتے ہیں۔ جی ایم سیّد کا قائداعظم سے اختلاف کسی اصول پر نہیں، محض تین نشستوں پر تھا۔ جی ایم سیّد چاہتے تھے کہ ہالا، میرپور خاص، اور نواب شاہ کی نشستیں ان کے نامزد افراد کو ملیں جبکہ حکومتی عہدیدار دوسرے اُمیدواروں کے حامی تھے۔ جی ایم سیّد نے اس کشمکش پر قائداعظم کو خط لکھا جس میں انہیں بتایا کہ حکومت ان سے تعاون نہیں کر رہی ہے۔ انہوں نے قائداعظم سے مداخلت کی اپیل کی۔ قائداعظم نے اس مسئلے کو نمٹانے کے لیے مرحوم قاضی عیسیٰ کو ثالث بنا کر بھیجا مگر وہ مسلم لیگ کے دونوں دھڑوں کے درمیان سمجھوتہ کرانے میں ناکام رہے۔ بہر حال قائداعظم نے جی ایم سیّد سے کہا کہ وہ اختلافات ختم کرنے کیلئے فراخدل بنیں اور سیٹوں کو مسئلہ نہ بنائیں۔ ہم ایسی منزل پر ہیں جہاں اختلاف کی گنجائش نہیں بلکہ مسلم قوم اختلاف کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے ساتھ ہی قائداعظم نے فیصلہ دیا کہ جی ایم سیّد اکثریت کی بات تسلیم کر لیں۔ قائداعظم کا یہ جواب ملنے پر جی ایم سیّد نے کراچی میں صوبائی لیگ کی کونسل کا اجلاس طلب کیا۔ پیر علی محمّد راشدی، ان دونوں جی ایم سیّد کے مشیرِ خاص تھے۔ انہوں نے ایک خاص پس منظر میں جی ایم سیّد کو اُکسایا اور مرکزی مسلم لیگ کا فیصلہ نہ ماننے اور آزادانہ طور پر اپنے اُمیدوار کھڑے کرنے کا مشورہ دیا۔ وہ خاص پس منظر یہ تھا کہ جب مسلم لیگ نے مرکزی قانون ساز اسمبلی کے لیے پیر علی محمّد راشدی کے بجائے یوسف ہارون کو

ٹکٹ دیا تو وہ ناراض ہو گئے تھے اور انہوں نے جی ایم سیّد کو بھڑ کا کر اپنی انا کی تسکین کی۔ جب کراچی میں جی ایم سیّد کی طلب کردہ صوبائی کونسل کا اجلاس ہوا تو وہاں میں نے بھی تقریر کی۔ میں نے جی ایم سیّد کو مشورہ دیا کہ وہ قائداعظم کا حکم مان لیں اور ان کے فیصلے سے انحراف نہ کریں جہاں تک مجھے یاد ہے پوری کونسل میں میری تنہا آواز جی ایم سیّد کے رویّے کے خلاف تھی۔ میری بات نہیں سُنی گئی اور جی ایم سیّد اور ان کے ساتھیوں نے اپنے علیحدہ امیدوار کھڑے کرنے کا اعلان کیا۔ اس کے بعد قائداعظم نے جی ایم سیّد کو ان کے ساتھیوں سمیت مسلم لیگ سے خارج کر دیا اور مسلم لیگ کی موجودہ باڈی توڑ کر ایڈہاک کمیٹی بنائی گئی جس کا چیئرمین یوسف ہارون اور سیکرٹری مجھے بنایا گیا اس زمانے میں سندھ اسمبلی ساٹھ ارکان پر مشتمل ہوتی تھی تین ارکان نامزد ہوتے تھے جو کہ انگریزوں میں سے لیے جاتے تھے، جب انتخابات ہوئے تو مسلم لیگ کو دو طرفہ بلکہ سہ طرفہ مقابلہ کرنا پڑا، چالیس مسلم نشستوں میں سے ۲۱ مسلم لیگ نے حاصل کیں اور ۹ سیّد گروپ نے لیں، جب کہ ۲۰ نشستیں ہندو ارکان کی تھیں اس طرح اگرچہ مسلم لیگ کی وزارت بن گئی لیکن جب کبھی کسی مسئلہ پر اسمبلی میں رائے شماری ہوتی سیّد گروپ کے مسلمان، ہندو ارکان سے مل جاتے اور مسلم لیگ کو شکست ہو جاتی۔ ایک وقت یہ آیا کہ مسلم لیگ نے ایک ووٹ کی خاطر اپنے اسپیکر میراں محمد شاہ کو استعفیٰ دلوایا اُدھر ہندو ارکان نے اپنے ڈپٹی اسپیکر کو مستعفی کرا دیا اس صورتحال پر گورنر نے مرکزی حکومت کی اجازت سے آئینی تعطل دُور کرنے کے لیے اسمبلی توڑ دی اور دوبارہ انتخابات کا اعلان کیا جب جنوری ۱۹۴۶ء میں دُوبارہ انتخابات کا اعلان ہوا تو قائداعظم اور مسلم لیگی قیادت کے لیے سب سے اہم بات یہ تھی کہ سیّد گروپ سابقہ پوزیشن میں نہ جیت سکے کیونکہ آئندہ اسی اسمبلی کے ذریعے پاکستان کے حق میں قرارداد پاس کرنے کا مسئلہ بھی تھا تاکہ کیبنٹ مشن کے فیصلے کے مطابق صوبے کے منتخب نمائندوں کی حمایت بھی حاصل ہو۔ جب مسلم لیگ نے ٹکٹوں کے لیے درخواستیں مانگیں تو عام حلقوں کے لیے درخواستیں آئیں مگر جی ایم سیّد کے خلاف لڑنے پر کوئی آمادہ نہ ہوا۔ یہ حلقہ سندھ میں رقبے کے لحاظ سے سب سے بڑا اور مشکل حلقہ تھا۔ پھر قائداعظم کی خواہش تھی کہ جی ایم سیّد سے بھرپور مقابلہ کیا جائے، میری عمر اس وقت ۲۴ سال تھی، میں نے ایک نوجوان کی حیثیت سے عزم و ہمت کا

مظاہرہ کرتے ہوئے خود کو مقابلے کے لیے پیش کیا اس سلسلے میں میری ملاقات چودھری خلیق الزماں سے ہوئی انہوں نے لیاقت علی خاں سے ملوایا۔ لیاقت علی خاں نے کہا ہم تو آپ کو نامزد کرنے کے لیے تیار ہیں لیکن اس نشست کی اہمیت کے پیشِ نظر حتمی منظوری خود قائداعظم دیں گے۔ لہٰذا انہوں نے مجھے قائداعظم سے ملاقات کا اعزاز بخشا۔ یہ ملاقات ہارون ہاؤس میں ہوئی قائدِ ملت اور چودھری خلیق الزماں بھی موجود تھے۔ میں نے پٹھانوں کے انداز میں کلاہ باندھی ہوئی تھی۔ یہ میری پہلی ملاقات براہِ راست اور یادگار ملاقات تھی۔

قائداعظم نے پہلا سوال یہ کیا:

"نوجوان تمہاری کامیابی کے کیا امکانات ہیں"؟

میں نے نپے تلے انداز میں کہا:

"میں آپ کی دعاؤں سے کامیاب ہو کر دکھاؤں گا"۔

اس کے ساتھ ہی میں نے مختصراً اپنی کامیابی کے امکانات پر گفتگو کی۔ قائداعظم نے مسکراتے ہوئے کہا:

"ٹھیک ہے! میری دعائیں تمہارے ساتھ ہیں"۔ اس کے بعد قائدِ ملتؒ اور چودھری خلیق الزماں سے کہا کہ میں اس حلقے کا خود دورہ کروں گا۔ میری انتخابی مہم کے لیے مرکزی مسلم لیگ نے یوسف ہارون، جی الانا اور اے ایم قریشی کی سرکردگی میں ایک نگران کمیٹی بھی بنائی۔ سارے "برِصغیر" کے مسلم اکابرین اور مسلم لیگی ورکرز نے حتی المقدور میرے لیے کام کیا۔ یہ بھی طے پایا کہ قائداعظم کوٹری سے دادو تک خصوصی ٹرین میں سفر کر کے جگہ جگہ عوام سے خطاب کریں گے، لیکن گول میز کانفرنس کے سبب قائداعظم کو لندن جانا پڑ گیا لہٰذا یہ پروگرام ملتوی کر دیا گیا، مگر قائداعظم نے میری انتخابی مہم کے لیے کراچی میں آرام باغ میں ایک عظیم الشان جلسہ عام سے خطاب کیا۔ اس جلسے میں تقریر کرتے ہوئے قائداعظم نے کہا تھا:

"جاؤ اور جا کر "سید" کو عبرتناک شکست دو"

اپنے قائد سے یہ میری دوسری ملاقات تھی۔ تیسری ملاقات اس وقت ہوئی جب میں "سید" کے مقابلے میں کامیاب ہو گیا۔ چوتھی ملاقات قیامِ پاکستان کے بعد ہوئی۔ اس

وقت میں قائداعظم کے حضور مہاجرین کی آباد کاری میں درپیش مسائل لے کر گیا تھا میری پانچویں ملاقات پیر الٰہی بخش کے ساتھ ہوئی۔ یہ ملاقات اس مقصد کے لیے تھی کہ الیکشن ٹریبونل میں اے کے بروہی نے جی ایم سیّد کی طرف سے میرے خلاف انتخابی عذر داری دائر کردی تھی۔ پیر الٰہی بخش وزیراعلےٰ اور قائداعظم گورنر جنرل تھے میں نے قائداعظم سے کہا کہ وہ آرڈی ننس جاری کردیں کہ الیکشن ٹریبونل گورنر جنرل کی منظوری کے بغیر کوئی پٹیشن قبول نہیں کرے گا۔ قائداعظم نے کہا: "یہ آرڈی ننس اگر میں جاری کر بھی دوں تو تمہیں کیا فائدہ ہوگا۔ تمہارے خلاف پٹیشن تو منظور ہو چکی، میں نے کہا آپ آرڈی ننس تو بیشک آج جاری کریں گے لیکن وہ نافذالعمل سابقہ تاریخوں سے ہوگا۔ قائداعظم نے بلا تاخیر کہا: میں یہ غیر آئینی اور غیر قانونی کام کبھی نہیں کر سکتا۔ اس بات نے میرے دل میں قائد کی عظمت اور بڑھادی اور مجھے اندازہ ہوا کہ قائداعظم عملاً قانون کی عظمت اور سربلندی کے علمبردار ہیں۔ وہ مخالفین سے بھی قانونی حدود میں لڑنا چاہتے ہیں۔ میری چھٹی اور آخری ملاقات زیارت میں ہوئی۔ جب کراچی کو سندھ سے علیٰحدہ کرنے کی بات چلی تو میں ایک پانچ رکنی وفد کے ساتھ قائداعظم سے ملاقات کے لیے زیارت گیا۔ وہ ان دنوں بیمار تھے۔ وفد میں میرے علاوہ ہاشم گزدر، رئیس علی محمد مری (عطا محمد مری کے والد) سیّد علی اکبر شاہ (جامعہ عربیہ اسکول حیدرآباد کے بانی) اور آغا غلام نبی پٹھان شامل تھے مجھے اس بات پر فخر ہے کہ قائد نے ہماری بات توجہ سے سنی اور ہمارے مؤقف کی تائید بھی کی۔ میری اس کے بعد مسلمانوں کے اس عظیم لیڈر سے پھر ملاقات نہ ہو سکی کہ موت نے قائداعظم کو زیادہ مہلت نہ دی۔ قائداعظم کی اتنی جلد وفات بھی پاکستان کے لیے سانحہ ہے۔ وہ اگر زندہ رہتے تو شاید حالات مختلف ہوتے"۔

قاضی اکبر نے جی ایم سیّد کے خلاف انتخابی معرکے میں ہونے والی دھاندلی کا اعتراف بھی کھلے دل سے کیا تھا:

"سچ پوچھتے ہیں تو عرض کروں کہ دھاندلی دونوں طرف سے ہوئی جس کو جیسا موقع ملا اس نے ہاتھ دکھایا۔ ایک مثال دیتا ہوں۔ ایک پولنگ اسٹیشن پر تقریباً ۷۰۰ ووٹ رجسٹرڈ تھے۔ کہیں بھی نہیں ہوتا کہ تمام ووٹ پڑ جائیں اور ایسی جگہ جہاں مکانات دور دور پہاڑوں پر ہیں، ووٹنگ کا تناسب بہت کم رہتا ہے مگر جب نتیجہ آیا تو جناب جی ایم سیّد

کے ڈبے سے کُل رجسٹرڈ شدہ ووٹ نکلے ۔ نہ ایک ووٹ مخالفت میں پڑا اور نہ کم پڑا حالانکہ یہاں تین چار سوافراد سے زائد لوگ ووٹ دینے نہیں پہنچے تھے ۔ لہٰذا یہ کہنا دُرست نہیں کہ دھاندلی صرف ایک جانب سے ہوئی اور ہاں اس انتخاب میں دونوں جانب سے اخراجات کی مقررّہ حد کی بھی جو غالباً دس ہزار تھی ، خلاف ورزی ہوئی ۔ مجھے اس الیکشن کے لیے اپنا سول لائنز کا مکان گروی رکھنا پڑا تھا اور میرے اپنے ذاتی تیس ہزار روپے خرچ ہوئے تھے جبکہ پارٹی کے ہزاروں روپے علیٰحدہ ہیں ۔

قاضی اکبر مرحوم کے بھائی قاضی عبدالمجید عابد اپنے نامور بھائی اور خاندان کا ذکر کرتے ہوئے بتاتے ہیں کہ :

ہمارے والد قاضی عبدالقیوم اپنے تین بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے ۔ سب سے بڑے بھائی مولانا حافظ حکیم مُحمّد زمان کی زندگی زیادہ تر بھون میں گزری ، جب کہ مولانا حکیم فتح مُحمّد سہوانی اور قاضی عبدالقیوم نے سیاست اور ادب میں بڑا نام پیدا کیا ۔ حکیم فتح مُحمّد سہوانی کراچی میں مقیم رہے اور اُنہوں نے قومی سیاست میں بھرپور حصّہ لیا ۔ ان کا نہ صرف سندھی شاعری اور ادب میں مقام ہے بلکہ آپ انجمن ترقی اُردو کے بانی ممبر بھی تھے ۔ قاضی عبدالقیوم نے بھی قومی سیاست میں بڑا نام پیدا کیا ۔ ریشمی رومال تحریک کے سلسلے میں انگریز کے خلاف بغاوت کے الزام میں سندھ سے سب سے پہلے قاضی عبدالقیوم اور حکیم فتح مُحمّد گرفتار ہوئے ۔ قاضی عبدالقیوم اپنے بھائیوں میں سب سے پہلے انتقال کر گئے ۔ ۱۹۳۰ء میں ۴۳ سال کی عمر میں جب ان کا انتقال ہوا تو یہ میونسپلٹی کے صدر تھے ۔

قاضی اکبر جو اکتوبر ۱۹۱۰ء کو پیدا ہوئے تھے ، اپنے والد کی خالی کردہ نشست پر ۲۱ سال کی عمر میں میونسپلٹی کے کونسلر اور پھر نائب صدر بنے ۔

قاضی عبدالقیوم کی پہلی بیوی سے جو بچے کی پیدائش کے وقت انتقال کر گئیں تھیں قاضی مُحمّد اکبر ، قاضی عبدالمجید عابد اور ایک بیٹی پیدا ہوئی ۔ دوسری بیگم سے قاضی مُحمّد اکرم ، قاضی مُحمّد اعظم اور چار بہنیں پیدا ہوئیں ۔ قاضی عبدالقیوم کے چاروں صاحب زادوں کو حج کی سعادت حاصل ہوئی ۔

قاضی اکبر نے جس زمانے میں میدانِ سیاست میں شہرت کی بلندی کو چھوا ، وہ

دور ایسا تھا کہ پیری مریدی اور جاگیرداری کے بغیر سیاست میں رہنے کا تصوّر تک نہیں کیا جا سکتا تھا۔

والد کے جلد انتقال کے سبب نہ صرف خاندان بھر کی ذمہ داری ان پر آپڑی تھی بلکہ انہیں سیاست میں اپنے خاندان کے نام کو روشن بھی رکھنا تھا۔ قاضی اکبر سندھ مدرسہ کراچی اور علی گڑھ یونیورسٹی سے میٹرک اور انٹر سائنس پاس کرنے کے بعد حیدرآباد میں ایل سی پی ایس کی تعلیم حاصل کر رہے تھے اور آخری سال میں تھے۔ یہ امتحان بمبئی یونیورسٹی کے تحت ہوتا تھا۔ قاضی اکبر اپنے والد کی خواہش پر پیشہِ طب کو اپنانا چاہتے تھے مگر والد کے انتقال نے ہی انہیں تعلیم منقطع کرنے اور کتابِ سیاست کھولنے پر مجبور کر دیا۔

قاضی اکبر نہ صرف بہترین مقرّر تھے بلکہ تحریر کی صلاحیت بھی رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنی ذاتی صلاحیتوں اور خوبیوں کے بل بوتے پر اپنا مقام پیدا کیا۔ ۱۹۴۶ء میں جی ایم سیّد کے مقابلے میں انتخاب کیا لڑے کہ پورے برِّصغیر میں متعارف ہو گئے، یہ ان کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا۔ اس انتخاب میں مسلم لیگ نے ان کی انتخابی مہم کے لیے میاں افتخار الدین، میاں دولتانہ، مولانا عبدالقیوم کانپوری، راجہ غضنفر، پیر صاحب زکوڑی شریف، پیر صاحب مانکی شریف، اور مولانا داؤد غزنوی جیسی شخصیات کو بھیجا تھا۔

پاکستان کے پہلے وزیرِاعظم خان لیاقت علی خان وزیرِاعظم کی حیثیت سے ایک بار حیدرآباد آئے تو قاضی اکبر کو اپنے گھر ۲۴ سول لائنز میں استقبالیہ دینے کا اعزاز حاصل ہوا۔ ۱۹۵۳ء میں انہیں اہلِ حیدرآباد نے بلا مقابلہ سندھ اسمبلی کا رکن منتخب کیا، تو قاضی اکبر نے میونسپلٹی کی صدارت چھوڑ دی، جس کے لیے ان کے بھائی قاضی عابد اُمیدوار بنے اور قاضی اکبر کے حریف میر رُسول بخش نے خود قاضی عابد کا نام تجویز کیا۔

پیر زادہ عبدالستار اور کھوڑو کی وزارت میں مختلف قلمدانوں کے ساتھ وزیر رہے اور سندھ کی سیاست میں اہم کردار ادا کیا۔

قاضی عابد کہتے ہیں میرا بھائی نہ صرف ذہین اور زیرک تھا بلکہ سیاست میں میرا رہنما بھی۔

قاضی اکبر کی پہلی شادی ۱۹۲۶ء میں ہوئی۔ پہلی بیوی سے جن کا انتقال ہو چکا ہے چھ بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں، بیٹوں میں خالد، سعید، جمیل، رشید، نظیر اور

منیر شامل ہیں۔ منیر پولیو کے مرض کا شکار اور اپاہج ہے، اس کے سوا تمام کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

دوسری شادی ۱۹۴۷ء میں ہوئی۔ دوسری بیگم سے جو بقید حیات ہیں چار بیٹے اور چار بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ ان بیٹوں میں اسلم اکبر شادی شدہ ہیں جبکہ ۹ مئی ۱۹۷۶ء کو سلیم ٹریفک کے حادثے میں انتقال کر گئے تھے، محمدؐ ایوب اور محمدؐ علی ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔ بہنوں میں دو کی شادیاں ہو چکی ہیں۔

قاضی اکبر اپنی طویل سیاسی زندگی میں صرف ایک بار قید ہوئے، وہ بھی یحییٰ خاں کے زمانے میں صرف دو ماہ کے لیے۔ ورنہ قاضی اکبر کے لیے مشہور ہے کہ انہوں نے ایجی ٹیشن، قید و بند اور نقصان کی سیاست سیکھی ہی نہیں تھی۔

قاضی اکبر اپنے جواں سال بیٹے سلیم کی موت کے بعد بُجھ کر رہ گئے تھے۔ میر رسول بخش تعزیت کے لیے گئے تو وہ بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے اور کہا "میر صاحب مجھے اپنی خطاؤں کی اتنی کڑی سزا ملے گی، یہ سوچا بھی نہ تھا"۔

بالآخر یہی صدمہ ان کی زندگی کے ابواب کو سمیٹ کر لے گیا اور سندھ کے اس نامور اور تاریخ ساز سیاست دان کی کتابِ زندگی ۱۳ فروری ۱۹۷۹ء کو بند ہو گئی۔

ایک یادگار گروپ فوٹو۔ جب قاضی اکبر سندھ وزارت میں لئے گئے اور انکی جگہ قاضی عابد بلدیہ حیدرآباد کے چیئرمین بنے ۔ کرسیوں پر پہلی صف میں
ابراہیم گلزار، فیض محمد صندل، سیّد اکرم شاہ، کے بی جعفر، بیگم طاہرہ آغا، قاضی محمد اکبر، قاضی عابد، مجیب النساء اکرم،
میر رسول بخش تالپور، سیّد غلام مصطفےٰ شاہ، سردار محمد علی شاہ جاموٹ اور حاجی غلام علی میمن ۔ پچھلی صف میں محمد عرس سموں،
حیدر علی شالوانی، سیٹھ کمال الدین میمن اور اسماعیل منشی وغیرہ۔ فرشی نشست پر خالد اکبر قاضی، گل شاہ، سیّد حاذق علی اور انور قاضی عابدؔ

دورِ ایوبی میں گول میز کانفرنس کا تاریخی لمحہ ۔ قاضی اکبر کے ہمراہ قاضی عیسیٰ پروفیسر غلام اعظم اور دوسرے نمایاں ہیں ۔

قاضی اکبر حیدر آباد کی ایک تقریب میں امریکی سفیر ادیبل ریٹ اور ان کی اہلیہ کے ہمراہ

قاضی اکبر کی علالت کے دوران اسپتال میں ائر مارشل اصغر خان عیادت کر
رہے ہیں۔ مقامی صحافی اقبال حامد اور بدر جالنوی بھی بیٹھے ہیں۔ (۱۹۷۰ء)

قاضی اکبر کے جواں سال بیٹے سلیم کے انتقال پر ۱۹۷۶ء میں
صدر فضل الٰہی کا اظہارِ تعزیت، قاضی محمد اعظم اور اسلم اکبر قاضی بھی موجود ہیں

قاضی محمد اکبر اور غلام مصطفےٰ جتوئی وزیر اعلےٰ سندھ کی حیثیت سے۔ (فروری ۱۹۷۰ء)

پشاور ۱۹۰۱ء

۱۱ر ستمبر ۱۹۸۰ء حیدرآباد

مولانا عبدالقیوم کانپوری

برصغیر پاک وہند کے عظیم صحافی آنجہانی سردار دیوان سنگھ مفتون مدیر "ریاست" دہلی نے اپنی بے مثال کتاب "ناقابلِ فراموش" میں ایک قیدی کا ذکر کیا ہے، جس نے حضور سرور کائنات ﷺ کی یہ حدیث سُنا کر کہ جابر سُلطان کے سامنے کلمۂ حق کہنا سب سے بڑا جہاد ہے، اس غیر مسلم صحافی کے دل میں اسلام کی انقلاب آفریں عظمت کو ثابت کیا تھا۔ یہ قیدی مولانا عبدالقیوم کانپوری تھے۔

دیوان سنگھ مفتون نے لکھا ہے:

"میں ایک مقدمہ کے سلسلے میں دہلی جیل میں تھا۔ مولوی عبدالقیوم کانپوری بھی کسی الزام میں جیل آگئے۔ ان کا قیام اسپیشل وارڈ کے اس کمرے میں تھا، جہاں میں مقیم تھا۔ جیل میں انسان کا سارا وقت حالات پر غور کرنے اور مطالعہ کرنے میں گزر جاتا ہے، مولوی صاحب سے رات بھر باتیں ہوا کرتی تھیں۔ ایک روز مولوی صاحب نے مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی وہ حدیث سُنائی، جس میں کلمۃ الحق کے اظہار کو اشرف الجہاد کہا گیا ہے، میں نے جب یہ حدیث سنی تو میں نے غور کیا کہ اس شخصیت کی بلندی کا کیا اندازہ کیا جا سکتا ہے، جس نے حاکم وقت کے سامنے حق وصداقت کی آواز کو دُنیا کا سب سے بڑا جہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ جیل سے رہائی کے بعد میں نے قرآن اور احادیث کو پڑھنا شروع کیا۔ قرآن اور حدیثوں کے مطالعہ کے بعد مجھ پر دُوسری باتوں کے علاوہ اس حدیث کا بھی بے حد اثر ہوا، جس میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُعا کی ہے کہ یا اللہ مجھے غریبوں کی صف میں رکھنا اور مرنے کے بعد مجھے مسکینوں میں جگہ دینا۔"

برّصغیر کے اس عظیم صحافی کو متاثر کرنے والے مولانا عبدالقیوم کانپوری کون تھے؟ حضرت

رئیس امروہوی ان کی وفات پر لکھتے ہیں" زعیم حریت، سالار تحریکِ آزادی مولانا عبدالقیوم کانپوری کی وفات کی خبر سن کر بے ساختہ زبان سے نکلا کہ ایک ورق تاریخ پاکستان کا گم ہو گیا"

کسی شخصیت کو ملک و ملت کی تاریخ کا ورق قرار دیا جائے تو بات یقیناً غیر معمولی ہے جنابِ انعام درانی لکھتے ہیں "میں نے شیرِ کانپور مولانا عبدالقیوم کانپوری کے تعزیتی جلسے میں شرکت کی، جہاں سید محمد اسمٰعیل ذبیح تے، جو مولانا غلام یحییٰ ہزاروی کے صاحبزادے اور مولانا عبدالقیوم کانپوریؒ کے بھانجے ہیں، اپنی تقریر میں یہ انکشاف کیا کہ مولانا مرحوم سرحد کے خطیب حضرت مولانا عبدالغفور کے فرزند تھے اور کشمیریوں کے ایک برگزیدہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اطلاع میرے لیے نئی بھی تھی اور غیر معمولی بھی، پانچ سال میرا اور مولانا عبدالقیوم کا ساتھ رہا، جو ایک نہایت طوفانی زمانے کی رفاقت پر مشتمل تھا، مگر اس شب و روز کی رفاقت میں ہم دونوں میں سے کسی نے یہ معلوم کرنے کی کوشش نہ کی، کہ کس کی ولدیت کیا ہے اور کس کا مقامِ پیدائش کون سے جغرافیائی علاقے میں واقع ہے۔ اب سے ۳۵، ۴۰ سال پہلے کی بات ہے کہ ہمارے لیے بس یہی جاننا کافی اور ضروری تھا کہ ہم دونوں مسلمان ہیں۔ ایک ہی لشکر کے سپاہی ہیں، ہماری منزل ایک ہے، راستہ ایک ہے۔ اور بس"

ممتاز صحافی اور مولانا عبدالقیوم کانپوری کے بھانجے مولانا اسمٰعیل ذبیح اپنے ماموں کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"آج پاکستان کی سرزمین پر عیش کرنے والے عناصر سے کوئی پوچھے کہ یہ جو تم کو اس سرزمین پر عروج ملا ہے اور یہ جو تم کو ہر سمت میں ترقی کے کھلے میدان ملے ہیں اور یہ جو طالع آزما طبقے نے خود تعمیری کے بڑے بڑے مرحلے طے کئے ہیں، یہ پاکستان آخر کیسے بنا ہے؟ قائدِ اعظم کی مشعل لے کر کون کون کارکن اندھیروں کو روشن کرنے کے لئے دوڑے ہیں؟ کیسی کیسی مصیبتیں برداشت کر کے تحریکِ پاکستان کے جانباز کارکنوں نے قیامِ پاکستان کی راہ ہموار کی ہے؟ اس کی کچھ تاریخ تو محفوظ رکھی جائے تاکہ ہم ایک سپاس گزار قوم بن سکیں، مولانا کانپوری مرحوم نہ لیڈر پیشہ تھے، نہ ایسے دانشور تھے، جو پُر تعیش زندگی کے ایک مشغلے کے طور پر نکتہ وری کرتے ہوں۔ وہ عملی اور مجاہدانہ زندگی کو ہی قومی خدمت سمجھتے تھے۔ وہ قومی تحریکات کی "ٹاسک فورس" کے سپاہی تھے، جو سر ہتھیلی پر رکھ کر قومی مقاصد حاصل کرنا اپنا فرض سمجھتے ہیں"۔ اسی مضمون میں مولانا اسمٰعیل ذبیح ایک جگہ لکھتے ہیں۔

مولانا کانپوری مرحوم کی جرأت مندی اور دلیری ضرب المثل بن چکی تھی، ایک بڑی سی تلوار لیگ نیشنل گارڈز کے سالار کی وردی میں آویزاں ہی نہیں رہتی تھی بلکہ گھنی ہندو آبادیوں کی مسلم اقلیت کے جلسوں میں بے نیام ہو جاتی تھی اور مولانا قیام پاکستان کے لیے تلوار لہرا کر تقریر کرتے تھے۔ اس جوش و خروش اور اس بہادرانہ سج دھج کو دیکھ کر مسلمانوں کے حوصلے جس طرح بلند ہوتے اور جس طرح ان کے دلوں سے ہندو اکثریت کا خوف نکل جاتا، اس کا تاریخی ثبوت ۱۹۴۶ء کے مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات ہیں، جن میں غالب ترین ہندو اکثریت میں گھرے ہوئے لاکھوں مسلمانوں نے مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب بنایا، جو قیام پاکستان کی ناقابلِ شکست بنیاد بن گیا۔"

مولانا عبدالقیوم کانپوری نے قیام پاکستان کے بعد نہ صرف عسرت و تنگ دستی کی زندگی بسر کی بلکہ ابتلا و آزمائش سے بھی گزرے، محرّم فائرنگ کیس کے سلسلے میں ان پر بننے والے مقدمات اس کا واضح ثبوت ہیں۔

قیامِ پاکستان سے قبل ان کی شعلہ بیان خطابت کے سبب قائدِ اعظم نے انہیں قاضی اکبر کی انتخابی مہم کے لیے بطورِ خاص سندھ بھیجا تھا۔ اس معرکہ میں قاضی اکبر نے جی ایم سیّد کو شکست دی تھی۔ پاکستان بننے کے بعد حیدر آباد سندھ ہی ان کی منزل ٹھہرا۔ میر رسول بخش ان کے سب سے گہرے دوست بنے اور دونوں نے یہ دوستی چوتھائی صدی سے زیادہ عرصے تک خوب نبھائی۔ مولانا کے انتقال پر روزنامہ "جنگ" نے لکھا کہ انہوں نے اپنی معرکۃ الآرا زندگی میں نہ انگریز سے ہار مانی نہ ہندو سے شکست کھائی لیکن موت کے ہاتھوں شکست کھا گئے۔

مولانا کانپوری کے انتقال پر "جنگ" ہی میں ممتاز صحافی اقبال حامد نے، جو ان کے پڑوسی بھی رہے ہیں، یہ تاثرات قلمبند کیے:

"قائدِ اعظم کے ۳۲ ویں یوم وفات کے ختم ہونے میں آدھا گھنٹہ باقی تھا کہ ان کا ایک نائب اور جہادِ پاکستان کا نامور سپاہی مولانا عبدالقیوم کانپوری اس جہان سے گزر گیا۔ ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ء کی رات کو ساڑھے گیارہ بجے انہوں نے لیاقت میڈیکل کالج ہسپتال داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ مولانا کانپوری اگرچہ کئی ماہ سے بیمار تھے مگر ان کی زندگی کا آخری ہفتہ ایسا گزرا، جو دردناک بھی تھا اور شرمناک بھی۔ لطیف آباد میں ایک عزیز کے گھر ان پر دل کا دورہ پڑا۔ امراض قلب کے اس ماہر کو اطلاع دی گئی، جس کے یہ زیر علاج تھے۔ اس ماہر نے شام کو پونے چھ بجے کا وقت دیا اور جب اس کے

کلینک میں مولانا کانپوری کے نوعمر لڑکے کمال اور جمال ان کو لیے چھ بجے تک بیٹھے رہے تو اس ماہر معالج کا فون آیا" میں آج نہیں آؤں گا مریضوں کو مطلع کر دو"۔ ڈاکٹر کا کلرک، جو مولانا کی عظمت اور نازک حالت سے واقف تھا اس نے فون پر التجا کی کہ اُن کو آپ نے وقت دیا تھا۔ وہ دیر سے منتظر ہیں۔ان کی حالت نازک ہے۔ان دردمندانہ التجاؤں کا ماہر ڈاکٹر پر کوئی اثر نہ ہوا اور اس نے دُوسری بار آنے سے انکار کر کے فون رکھ دیا۔ شاید کلرک کو ڈانٹا بھی ہو۔ ع

یہ مَسیحا ہیں تو جلّاد کسے کہتے ہیں

بچے بے ہوش باپ کو لے کر راجپوتانہ ہسپتال پہنچے جہاں ان کو جنرل وارڈ کے بستر نمبر ۲ پر لٹا دیا گیا اور بلاشبہ راجپُوتانہ ہسپتال کے جُونیئر ڈاکٹروں نے بڑی محنت اور خلوص کے ساتھ خدمات انجام دیں اور راجپُوتانہ ہسپتال کے عملے کی قابلِ فخر خدمات کا سِلسلہ تین دن تک یکساں جوش کے ساتھ جاری رہا۔ چوتھے دن سندھ کے سابق گورنر میر رسول بخش تالپور کو خبر ہو گئی، جو خود ایک طویل مُدّت سے عارضۂ قلب میں مُبتلا ہیں، میر رسول بخش تالپور کو شیرِ سندھ کہا جاتا ہے اور بلاشبہ ان کے سینے میں شیر کا دل ہے، جو بیماری کے شدید حملوں کو پسپا کرتا رہا ہے۔اس حالت کے باوجود میر صاحب یہ سُن کر تڑپ اٹھے کہ جسدِ حرّیت کا ایک مُجاہد خیراتی ہسپتال میں پڑا ہے۔انہوں نے لیاقت میڈیکل کالج میں کارڈیالوجی کے پروفیسر کریم عباسی کی نیند حرام کر دی اور اُس وقت تک ڈاکٹر کریم عباسی کا پیچھا نہ چھوڑا جب تک کہ خود وہ راجپوتانہ ہسپتال جا کر مولانا قیوم کانپوری کو ایل ایم سی کے دیوان مشتاق کارونری یونٹ میں نہ لے آئے۔امراضِ قلب کے عِلاج کا یہ جدید ترین آلات سے لیس یونٹ حال میں ہی مکمل ہوا ہے۔جب ڈاکٹر کریم عباسی، مولانا کانپوری کو لائے اس وقت ان کے دماغ کی شریان پھٹ چکی تھی اور گُردے کام نہیں کر رہے تھے.....!

مولانا قیوم کانپُوری اور میر رسول بخش تالپور کے درمیان وہ دوستی تھی، جو اب کتابوں میں پائی جاتی ہے۔یہ دونوں گزشتہ ۲۳ برس کے دوران بعض اوقات متصادم جماعتوں میں رہے، مگر نہ صرف یہ کہ دوستی میں فرق نہیں آیا بلکہ سیاست اور مصلحت کی پروا کیے بغیر حق دوستی ادا کرتے رہے۔مثال کے طور پر ایوب خاں کے دور میں میر رسول بخش تالپور کو گرفتار کیا گیا تو مولانا قیوم نے کنونشن لیگ میں ہوتے ہوئے بھی اس اقدام کی مذمّت کی اور میر صاحب کو غیر مشروط رہا کرانے کی قرارداد منظور کرائی۔یہی حال میر رسُول بخش کا تھا۔۴۹ء میں حیدرآباد کے

سٹی تھانہ پر دس محرم کو فائرنگ ہوئی۔ قاضی فضل اللہ سندھ کے وزیر اعلیٰ تھے۔ اس حادثہ میں 9 آدمی ہلاک ہوئے اور 9 گرفتار ہوئے جن میں مولانا قیوم کانپوری بھی تھے جب کہ 8 ایسے آدمی تھے، جن کا گھر تھانہ در۔ اس کے باوجود میر رسول بخش تالپور ان لوگوں کی عدالت میں ضمانت دیتے رہے۔ مولانا کانپوری اور آٹھ دوسرے ملزموں پر 6 برس تک مقدمہ چلتا رہا، جو 7 عدالتوں میں گیا۔ ہر جگہ میر رسول بخش تالپور ضمانت کے لیے موجود ہوتے چنانچہ میر صاحب کو محرّم فائرنگ کا دسواں ملزم کہا جانے لگا۔ کیونکہ یہ ان کے مستقل ضمانتی تھے ۱۱

مولانا کانپوری کا تذکرہ خان آف قلات کی کتاب "دی بلوچ" میں، چودھری خلیق الزماں کی کتاب "شاہراہِ پاکستان" میں، چودھری فضل حق کی کتاب "تاریخِ احرار" میں اور حکیم نثار احمد علوی کی کتاب "شبِ چراغ" میں بھی ملتا ہے۔

سابق ڈائریکٹر اطلاعات اور ممتاز صحافی جناب اشتیاق اظہر اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں۔

"مولانا عبد القیوم کانپوریؒ سرحد کے نامور خطیب اور تحریکِ خلافت اور تحریکِ ہجرت کے اس صوبہ میں رکنِ رکین، مولانا عبد الغفور رحمۃ اللہ علیہ کے واحد فرزند تھے، آپ کی ولادت کانپور میں ہوئی اور یہیں آپ کی تعلیمی اور سیاسی زندگی کا آغاز ہوا۔ اور اسی نسبت سے آپ کانپوری کہلائے اور اپنی خداداد جرأت و ہمت اور ولولہ انگیز خطابت سے اپنے وطنِ ثانی کی عزت و توقیر کا باعث ہوئے۔

مولانا عبد القیوم نے اپنی تعلیمی زندگی مدرسہ جامع العلوم کانپور سے شروع کی۔ جہاں آپ کے برادرِ نسبتی مولانا غلام یحییٰ ہزاروی صدر مدرس کی مسند پر فائز تھے۔ لیکن آپ بہت جلد وہاں سے دار العلوم دیوبند چلے گئے، جہاں آپ نے اپنے وقت کے مشہور ترین اساتذہ حضرت مولانا سیّد انور شاہ کشمیریؒ، مولانا اعزاز علی، حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا مفتی محمد شفیع اور شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی علیہم الرحمہ سے اکتسابِ فیض کیا۔ لیکن آپ کو اپنے اساتذہ میں سب سے زیادہ لگاؤ حضرت کشمیریؒ کی ذات گرامی ہی سے رہا۔ ابھی آپ کو دار العلوم دیوبند میں قیام کیے صرف چار سال کا ہی عرصہ ہوا تھا کہ حضرت مولانا انور شاہ کشمیریؒ بعض اختلافات کے باعث دار العلوم دیوبند کی صدر مدرّسی سے کنارہ کشی اختیار کر کے ڈابھیل تشریف لے گئے اور مولانا شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مایہ ناز شاگرد حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ بھی دیوبند کا قیام ترک کر کے آپ کے ہمراہ ڈابھیل پہنچ گئے۔ اِن اساتذہ کرام کے، جو مخصوص

شاگرد اس نقلِ مکانی میں ان کے ساتھ تھے۔ ان میں حضرت مولانا محمد یوسف بنوریؒ کے ساتھ ساتھ حضرت مولانا عبدالقیوم کانپوریؒ بھی قابلِ ذکر حیثیت کے حامل تھے۔ مولانا کانپوری نے ڈابھیل میں مسلسل دو سال اپنے اساتذہ سے اکتساب کیا۔ لیکن بعض خانگی وجوہ کی بنا پر آپ اور زیادہ عرصہ تک ڈابھیل میں قیام نہ کر سکے۔ اور وہاں سے واپس کانپور لوٹ کر آپ نے اپنی دینی اور دنیوی تعلیم مدرسہ الٰہیات میں مکمل کی، جو حضرت مولانا آزاد سبحانی کی یادگار کی حیثیت سے اطراف واکناف میں مشہور تھا اور جہاں اس وقت آپ کے برادرِ نسبتی مولانا غلام یحییٰ، مولانا آزاد سبحانی کے جانشین کی حیثیت سے صدر مدرسی کے فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ مولانا کانپوری نے اس تاریخی مدرسہ میں مسلسل تین سال تک علم حاصل کیا اور یہیں سے فارغ التحصیل ہوئے۔

مولانا عبدالقیوم کانپوری کو جیسا کہ اوپر مذکور ہو چکا ہے، خطابت ورثہ میں ملی تھی۔ اور ان کے قیام دیوبند اور ڈھابیل میں انہیں حضرت شیخ الہندؒ کے نامور شاگردوں نے حریت کی تڑپ اور فرنگیوں سے نفرت و حقارت کے جذبات سے مملو کیا اور کانپور واپس آ کر انہوں نے مولانا غلام یحییٰ سے تبلیغ اور مناظرہ کے گر حاصل کیے۔ جس کے لیے مدرسۂ الٰہیات کا قیام عمل میں لایا گیا تھا۔ اس لیے فارغ التحصیل ہونے کے بعد وہ بہت جلد ایک اعلیٰ پایہ کے مبلغ، مناظر اور مجاہدِ حریت کی حیثیت سے سارے جنوبی ایشیا میں مشہور ہو گئے، اور مجلسِ احرار اسلام جس میں اس دور کے تقریباً سارے ہی شعلہ بیان مقرر اور طالبانِ حریت شامل تھے، شمولیت اختیار کر کے بہت جلد اس کے مرکزی صدر بن گئے۔ لیکن فرنگی استبداد کس طرح حامیانِ حریت و آزادی میں ایک اور شعلۂ جوالہ کا وجود برداشت کرتا۔ اس لیے انہیں گرفتار کرنے کا فیصلہ کیا گیا اور اس فیصلے کے بعد ان کی اسیری کا دور شروع ہوا۔ اس کے دوران انہوں نے راولپنڈی، لاہور، دہلی، کانپور، فرخ آباد، اناؤ، اٹاوہ، فتح گڑھ اور سہارنپور کی جیلوں میں تقریباً ایک درجن سال گزارے"

اسی مضمون میں آگے چل کر اشتیاق اظہر مولانا کانپوری کے مسلم لیگ میں شامل ہونے کے تاریخی واقعہ کا ذکر کرتے ہیں۔

"سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے، جنہیں وہ اپنا مرشدِ سیاسی بھی سمجھتے تھے، اپنی ساری توانائیاں مسلم لیگ کے لیے وقف کر دیں اور مسلم لیگ نے بھی انہیں کشادہ دلی کے ساتھ قبول کیا اور وہ بہت جلد یو۔ پی مسلم لیگ کونسل اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل کے

ممبر بن گئے۔ اس کے بعد ان کی ولولہ انگیز تقریروں اور کارنر میٹنگس نے بہت جلد عوام میں مسلم لیگ کی مقبولیت کو بامِ عروج تک پہنچا دیا۔ مگر مسلم لیگ میں بھی ان کی انفرادی شان و شوکت نمایاں رہی اور آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور یوپی مسلم لیگ کونسل میں ایک چھوٹا سا مگر فعّال اور سرگرم گروہ سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کو اپنا پیشوا مانتا تھا۔ مولانا عبدالقیوم کانپوری اس گروہ کے روحِ رواں تھے۔ لیکن اُن کی حُریت فکر جس طرح فرنگیوں کے اقتدار کے لیے زبردست خطرہ بنی ہوئی تھی، اسی طرح بہت جلد ان کی شعلہ افگن خطابت یو۔پی کی کانگریس حکومت کے لیے بھی سوہانِ روح بن گئی۔ اس لیے مسلم لیگ میں شمولیت کے تھوڑے عرصہ بعد ہی انہیں پنڈت گووند بلبھ پنت کے حکم پر گرفتار کر لیا گیا اور مسلم لیگی قائدین اور مسلم لیگی اخباروں کے بیانات اور اداریوں کے باوجود انہیں رہا نہیں کیا گیا۔ اس ضمن میں مختلف شہروں میں ان کی رہائی کے لیے مظاہرے بھی ہوئے اور احتجاجی جلوس بھی نکالے گئے۔ لیکن حکومتِ یو۔پی ٹس سے مس نہیں ہوئی اور جس روز پاکستان اور بھارت فرنگی تسلّط سے آزاد ہوئے اس روز بھی مولانا عبدالقیوم کانپوری، کانگریسی ہدایت کے تحت جیل میں قید تھے۔ جس کے باعث وہ ایک آزاد ملک کے شہری ہونے کے باوجود جیل کی زندگی سے آزاد نہیں ہو سکے اور اس کو ایک المیہ ہی کہا جا سکتا ہے کہ جس فردِ فرید اور مجاہد حُریت نے آزادی کے لئے بارہ سال جیل میں کاٹ دیے۔ وہ حصُول آزادی کے بعد بھی جیل کے دروبام میں مقید تھا لیکن اس المیہ کا ایک خوشگوار پہلو بھی تھا اور وہ یہ کہ مولانا کی اسیری اور سید الاحرار مولانا حسرت موہانی کی شمولیت کے باعث کوئی یہ نہیں کہہ سکتا تھا کہ مسلم لیگ صرف نوابوں، خان بہادروں اور جاگیرداروں کی جماعت ہے"

۱۹۰۱ء کو پشاور میں پیدا ہونے والا یہ بطلِ جلیل ۱۱ ستمبر ۱۹۸۰ کی شب کو رخصت ہو گیا۔ نمازِ جنازہ میٹر مولانا وصی مظہر ندوی نے پڑھائی، جب کہ چشم تر اور غم دل کے ساتھ کاندھا دینے والوں میں میر رسُول بخش تالپور، مولانا اسمٰعیل ذبیح، لعل بن یُوسف اور مولانا کے سینکڑوں ساتھی اور معتقدین شامل تھے۔ ملک کے ہر بڑے اخبار نے ان کے سانحۂ ارتحال کا ذکر کیا۔ "سیاستِ جدید" کانپور نے نمایاں طور پر اس خبر کو شائع کیا۔

مولانا کے پس ماندگان میں ایک بیوہ، دو بیٹے انور جمال اور انور کمال اور پانچ صاحبزادیاں ہیں۔ ایک بیٹی کانپور میں ہیں، جب کہ پاکستان میں موجود چار بیٹیوں میں سے دو کی شادی ہو چکی ہے۔ بڑے بیٹے انور جمال بھی شادی شدہ اور صاحب اولاد ہیں۔ مولانا کانپوری خود بھی ایک نامو

گھرانے کے فرزند تھے اور رشتہ داریاں بھی مشہور و معروف خاندانوں میں ہوئیں۔ بھارت میں مفتی نثار احمد کانپوری اور شاہ اسرار الحق مسلمانوں کی جانی پہچانی شخصیات ہیں۔ یہ مولانا قیوم کانپوری کے سُسرالی عزیز و اقارب ہیں۔

مولانا عبد القیوم کانپوری سے مجھ ناچیز کو شرفِ نیاز بھی حاصل رہا اور کئی بار انہیں سننے کا موقع بھی ملا۔ مجھے فخر ہے کہ وہ میری تحریر کو نہ صرف پسند کرتے تھے بلکہ انہوں نے اس کا برملا اظہار بھی کیا۔ اُن کی پسندیدگی کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میر رسول بخش مرحوم مجھے عزیز رکھتے تھے۔ گویا میں ان کے معتقد کا معتقد تھا، جب میں نے صحافت کے میدان میں قدم رکھا تو ایوب خاں کا زمانہ گزر چکا تھا اور اسی کے ساتھ مولانا کانپوری سیاست کے میدانِ خارزار سے دُور جاچکے تھے، گوشہ نشین ہوگئے تھے۔ مجھے اس کے باوجود ان کے بارے میں ان کی زندگی مین ہی نہ لکھنے کا ملال رہے گا، کیونکہ مولانا کانپوری پر لکھنا کسی ایک شخصیت پر لکھنا نہیں تھا۔ برصغیر پاک و ہند کی جدو جہدِ آزادی پر لکھنے کے مترادف تھا۔

مولانا عبدالقیومؒ کانپوری (انتہائی بائیں جانب) مصر کے صدر جمال عبدالناصر کے استقبالی جلوس میں،

صدر ایوب کے ہمراہ ۔ مولانا کانپوری کا "مشکل سفر"

جب ۱۹۶۶ء میں مسلم لیگ کنونشن کا ڈھاکہ میں کونسل سیشن منعقد ہوا۔ روانگی کے وقت وفد میں زیڈ اے بھٹو، خدا بخش بچہ، احمد سعید کرمانی اور مولانا عبدالقیوم کانپوری نمایاں ہیں۔

مولانا کانپوری کی خطابت کا انداز ۔ نبی بخش زہری ہمہ تن گوش ہیں۔
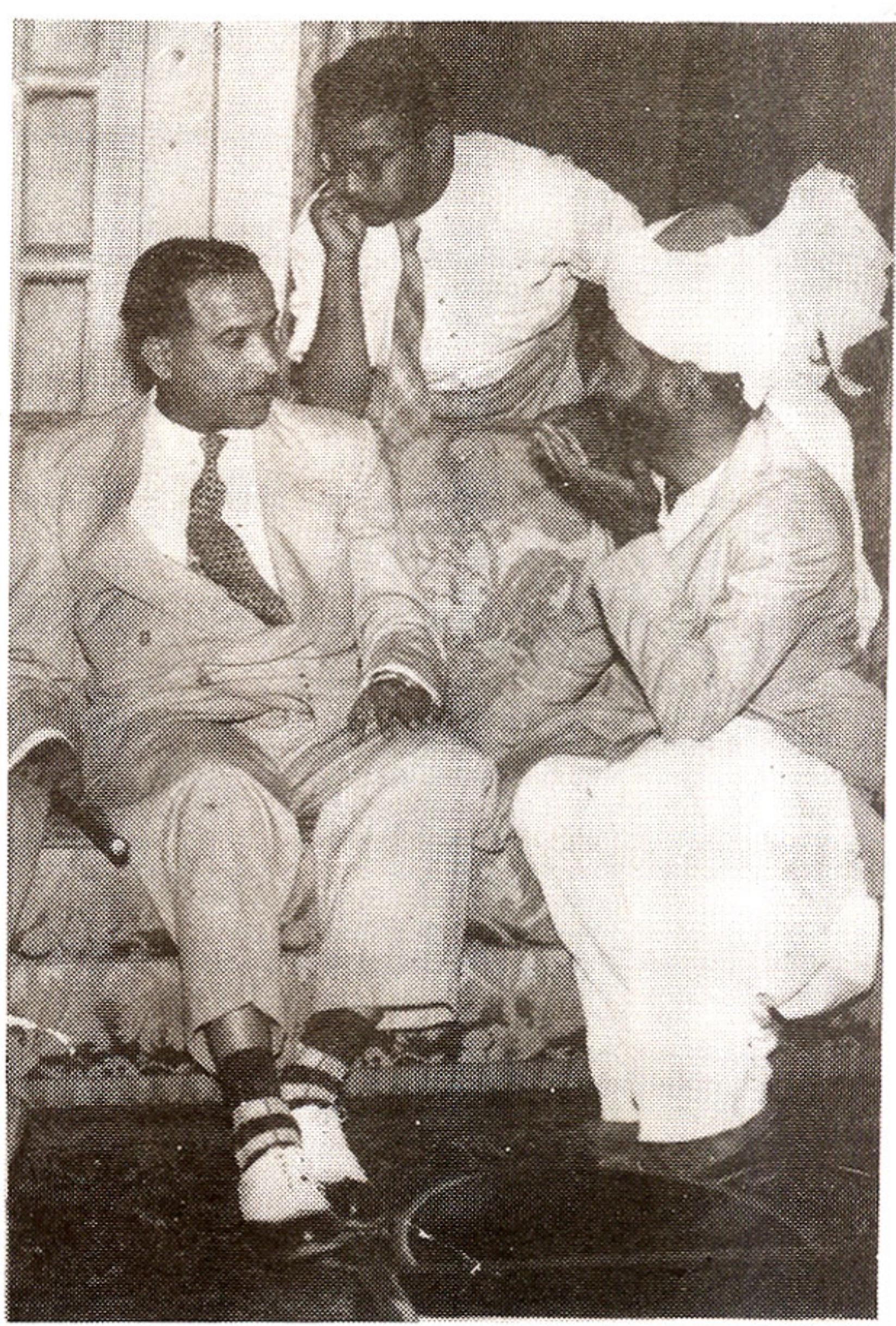
قاضی محمد اکبر سے مولانا عبد القیوم کانپوری کی گفتگو۔
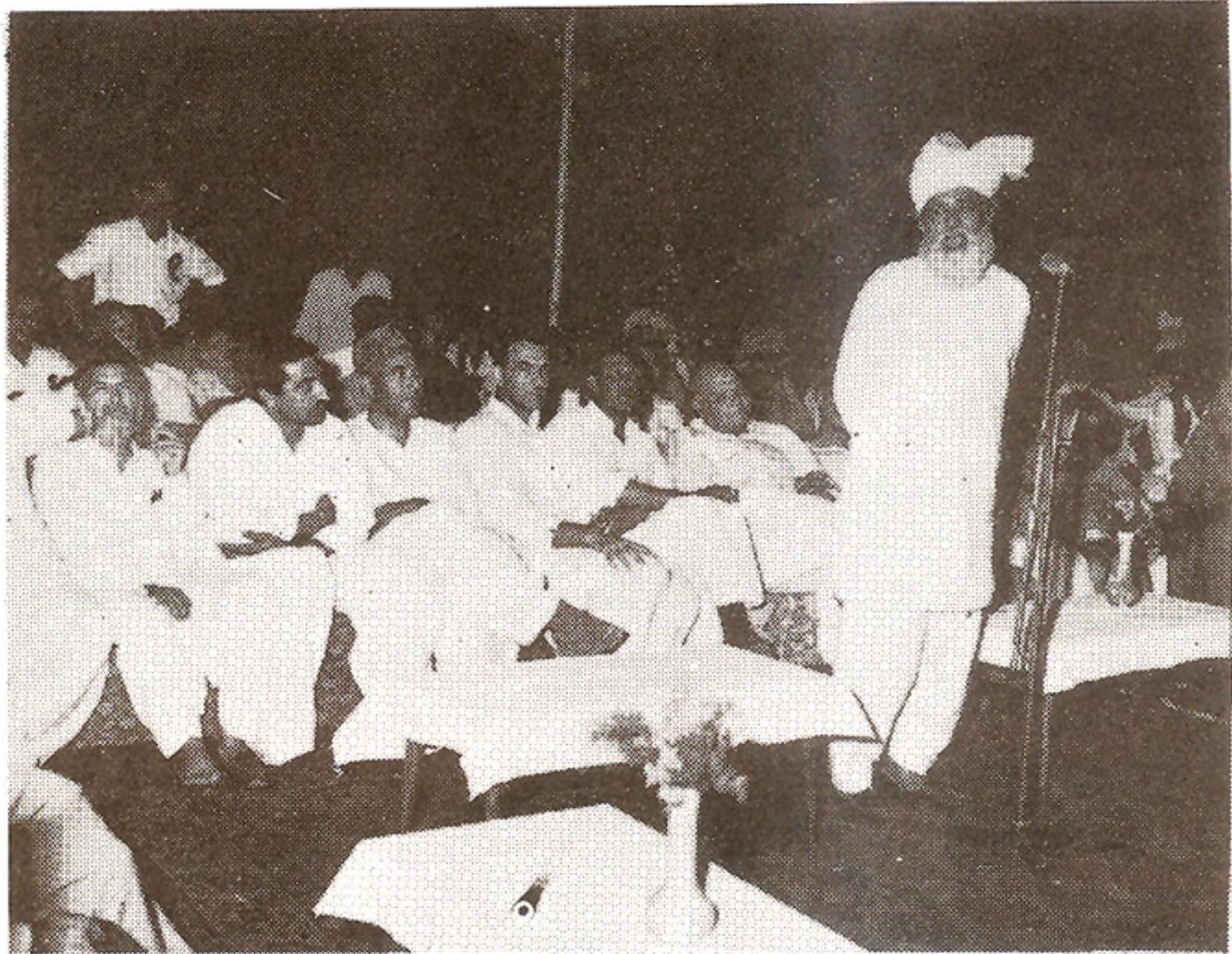
خان عبدالقیومؒ خان کی موجودگی میں مولانا کانپوری تقریر کر رہے ہیں۔
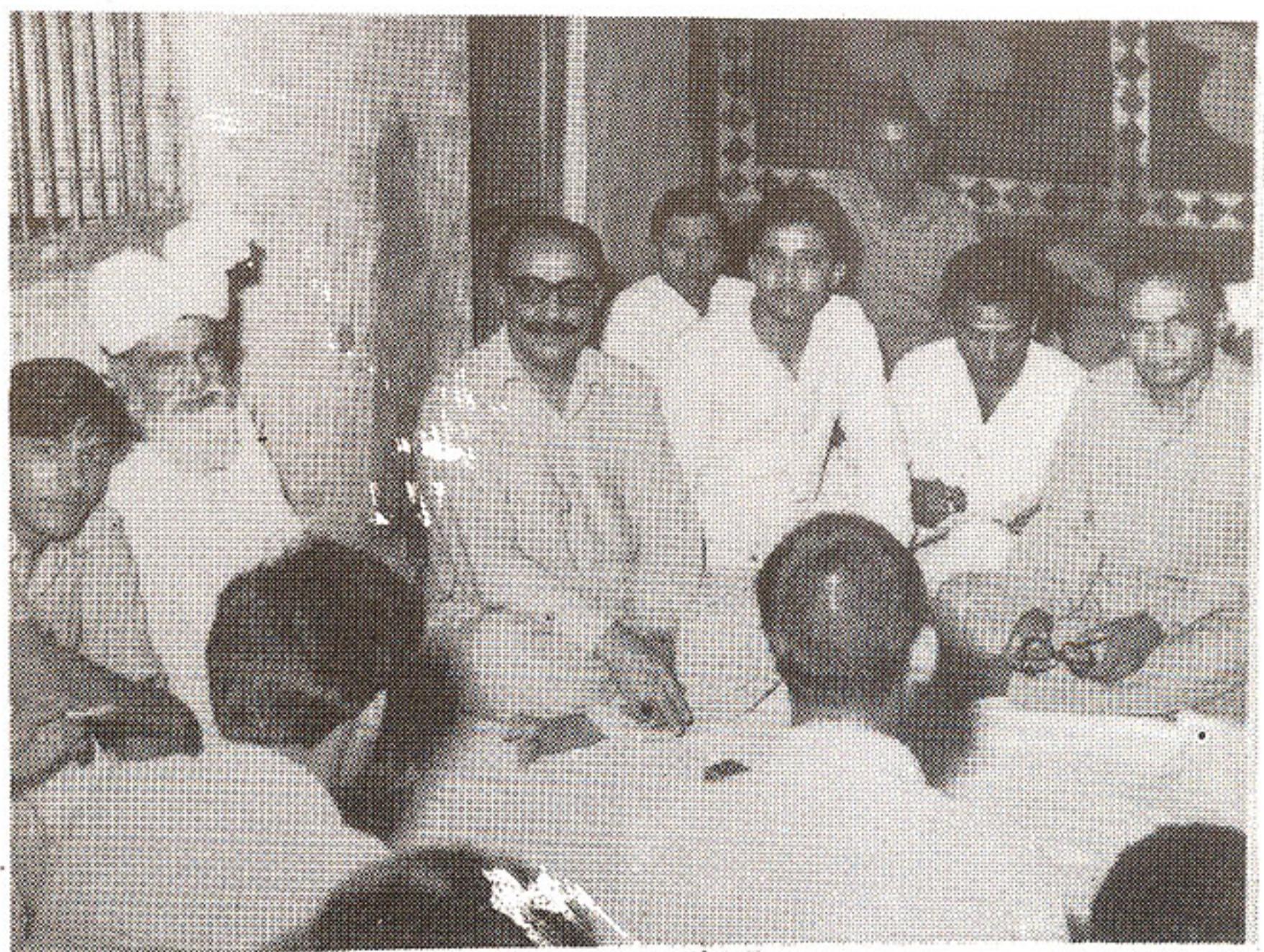
میر رسول بخش تالپور اور مولانا عبدالقیومؒ کانپوری ۔ دیرینہ دوستوں کی نشست
لعل بن یوسف، حاجی عدیل اور مولانا کے صاحبزادے تصویر میں دیکھے جا سکتے ہیں۔

مولانا کانپوری کے انتقال پر میر رسول بخش تالپور اور مولانا اسمٰعیل ذبیح کا ملال۔ ساتھ میں ممتاز صحافی قمر الزماں ہیں

مولانا کانپوری کی سفرِ آخرت پر روانگی - میر رسول بخش پھولوں کی چادر میت پر ڈال رہے ہیں، شیخ علی محمدؐ اور لعل بن یوسف بھی شریکِ غم ہیں۔
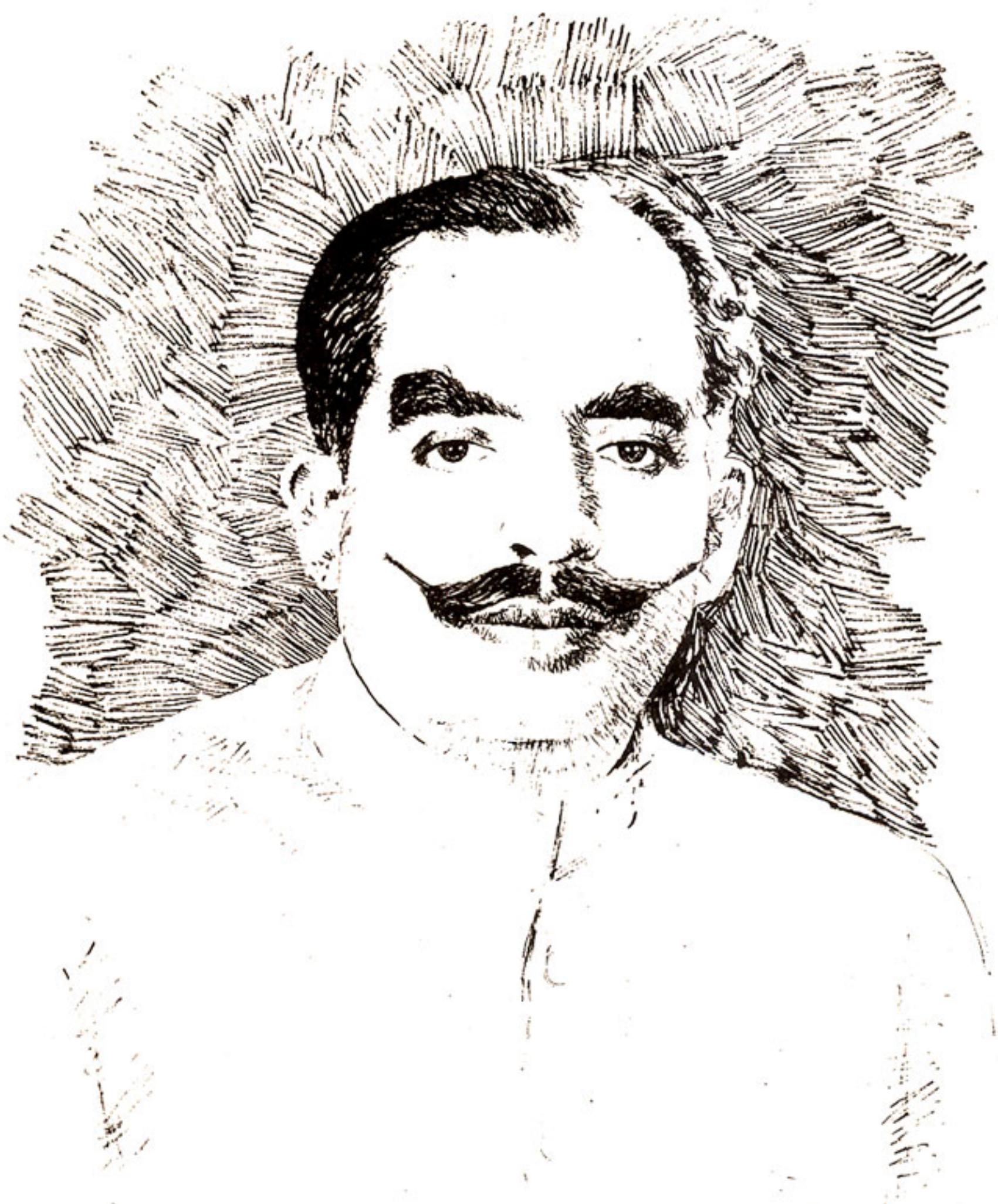
۲۳ ، اپریل ۱۹۲۱ء بلند شہر ریاست دان پور
۳۰ ، دسمبر ۱۹۸۰ء حیدر آباد

نوابِ مظفرؒ حسین خاں

نوابِ مظفرؒ حسین خاں سے سینکڑوں ملاقاتیں ہوئیں اور بارہا ان کے ہمراہ بیٹھنے اور گفتگو کرنے کا موقع ملا۔ میں نے جب وادیِ صحافت میں قدم رکھا تو پیپلز پارٹی برسرِ اقتدار آنے کی تگ و دو کر رہی تھی۔ سندھ میں لسانی عصبیّت عروج پر تھی اور اسی تعلق سے عصبیت کی سیاست بھی فروغ پا رہی تھی۔

نواب مظفر حسین آئے دن اپنی قیام گاہ ۳۵ سول لائنز میں اخبار نویسوں کو بلاتے، اخبار نویسوں میں نواب صاحب کے لیے مُتضاد آرا پائی جاتی تھیں۔ ۱۹۷۲ء اور ۱۹۷۳ء میں نواب صاحب کی سیاست کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ میں ایک کم عمر اخبار نویس ہونے کی حیثیت سے ہر ہر بات اور ہر ہر واقعہ کی رپورٹ بڑی محنت اور جانفشانی سے اپنے اخبار "جسارت" کو ارسال کر دیتا۔ بارہا ایسا بھی ہوا کہ میری ارسال کردہ خبروں پر جماعت اسلامی نے بُرا منایا۔

باوجود اس کے کہ نواب مظفرؒ کو ایک متعصّب لیڈر سمجھا جاتا تھا، میں نے انہیں ایک فراخ دل انسان پایا۔ وہ نماز روزے کی سختی سے پابندی کرتے، بزرگوں کی عزّت کرنا اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا ان کا وصف تھا۔ ان کی قیام گاہ پر متعدد تاریخی اجتماعات ہوئے۔

"مُہاجر پنجابی پٹھان محاذ" بنا کر دراصل وہ خود پھنس گئے تھے یا یوں کہیے کہ اتنی دُور چلے گئے تھے کہ گلے کا یہ ڈھول بجانے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، وگرنہ انہیں سندھیوں سے اتنی ہی محبت تھی جتنی کسی سرزمین پر نئے آباد ہونے والوں کو وہاں کے قدیم باشندوں سے ہونی چاہیئے۔ اے پی پی کے مرزا سلطان بیگ مرحوم کی موجودگی میں ایک بار تو نواب صاحب نے یہ

تک کہا تھا کہ "میں اس محاذ سے جان چھڑانا چاہتا ہوں، مگر آپ ہی بتائیے کہ راستہ کیا ہے۔ حقوق کی بات جس پلیٹ فارم سے کی جائے گی یہی الزام لگے گا کہ متعصّب ہو"۔

نواب مظفّر کو اس محاذ سے جان چھڑانے کا موقع یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو ملا جب پیر پگاڑو کو اُن کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پگاڑو، رامے اور کھر وغیرہ ان کے بنگلے پر جمع ہوئے اور ایک کنونشن میں انہوں نے مسلم لیگ میں پھر شامل ہونے کا اعلان کر دیا۔ حقیقتاً وہ مسلم لیگی تھے اور اسی جماعت کا مزاج رکھتے تھے۔ قیامِ پاکستان کی تحریک سے مادرِ ملّت کی تحریکِ بحالیِ جمہوریت تک۔

نواب صاحب نے مجھے اپنے بیٹوں کی طرح محبّت دی۔ اُن کی شفقت کا ایک واقعہ سُناتا چلوں۔ لسانی فسادات کے بعد جب اُس وقت کے صدر جناب بھٹو سندھ کے دورے پر نکلے تو انہوں نے سرکٹ ہاؤس میں نواب مظفّر سے ملاقات کی۔ نواب مظفر وفد کے ہمراہ تھے۔ یہاں بھٹو مرحوم کے ساتھ تلخی اور نرمی دونوں طرح بات ہوئی۔ ایک موقع پر بھٹو کی زبان سے "ٹھیک کر دینے" کی بات نکلی تو نواب صاحب اور ان کے ساتھی برہم ہو گئے۔ بھٹو کے ہاتھ میں "زندگی" رسالہ تھا، جسے انہوں نے لہرا کر کہا۔ "نواب صاحب میں آپ کے خلاف نہیں ہوں، نہ آپ کو دھمکی دے رہا ہوں، میں ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جو نفرت پھیلا رہے ہیں، ہم انہیں ٹھیک کر دیں گے، دیکھیں یہ کیا ہے"! اور پھر میرا مضمون "سندھ خون خون ہے" کھول کر دکھایا۔ نواب مظفر کو بھٹو کا موڈ دیکھ کر میری فکر ہوئی، باہر نکلتے ہی لپک کر میرے پاس آئے اور کہا "یہاں سے فوراً چلے جاؤ بھٹو سخت برہم ہے"۔ مجھے اندر ہونے والی گفتگو مختصراً سنائی اور میں اُن کا مشورہ مان کر چلا آیا۔ مگر سہ پہر کو ایک رپورٹر کے ساتھ موٹر سائیکل پر ٹنڈو محمّد خان جا پہنچا، جہاں بھٹو کو خطاب کرنا تھا۔ بھٹو کے خطاب کے بعد میر اعجاز تالپور کے بنگلے پر محفل تھی۔ ہم بھی کسی نہ کسی طرح "رنگِ محفل" دیکھنے کے لیے میر اعجاز کے بنگلے میں داخل ہو گئے، جہاں ٹکّا خان، ممتاز بھٹو اور دیگر ہائی کمان موجود تھی۔ ٹکّا خان ہیلی کاپٹر میں بطورِ خاص پہنچے تھے۔ اخبار نویسوں کی دلجوئی کا بندوبست بھی تھا۔ یہاں کا جائزہ لے کر ہم واپس چلے آئے۔

لسانی فسادات کا زمانہ گزر گیا تو سندھ اسمبلی میں نواب مظفّر کی آواز تنہا رہ گئی۔ انہیں جمعیت علمائے پاکستان، جماعت اسلامی، مسلم لیگ کسی کی تائید و حمایت حاصل نہ رہی۔

لہٰذا اسینیٹرز کے چناؤ کا وقت آیا تو انہوں نے اپنا ووٹ حزب اختلاف کے متعیّن امیدوار کی بجائے پیپلز پارٹی کے سابق سیکرٹری جنرل جے اے رحیم کو دیا۔ حزب اختلاف نے ان پر بِک جانے کا الزام لگایا، لیکن نواب مظفّر نے جے اے رحیم کو ووٹ دینے کا سبب بتاتے ہوئے مجھ سے کہا، "وہ میرا اہم زبان ہے، اس لیے میں نے اسے ووٹ دیا ہے"۔

مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات آئے تو جماعت اسلامی نے نواب مظفر کے گرد گھیرا تنگ کیا اور بالآخر اپنی اس کوشش میں کامیاب ہوئی کہ لطیف آباد سے قومی اسمبلی کا ٹکٹ اس کے اُمیدوار کو ملے، حالانکہ نواب مظفّر لطیف آباد کے حلقے سے سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے اور ۱۹۷۰ء میں نواب مظفر کی مقبولیت دیکھ کر جماعت اسلامی کے میاں شوکت کو میدان چھوڑ دینے کے سوا چارہ نہ رہا تھا۔

نواب مظفر مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات میں توپس پردہ دھکیل دیئے گئے مگر جب انتخابی دھاندلیوں کے خلاف تحریک چلی تو ان کا قد پھر نمایاں رہا۔

بھٹو کی معزولی کے بعد نواب مظفر نے اپنی بیماری کے باوجود ساری توجّہ اس بات پر مرکوز رکھی کہ کسی طرح مہاجروں اور سندھیوں کا دائمی ملاپ ہو جائے۔ جی ایم سیّد سے ملاقات کے بعد انہیں اس کی اُمید ہو چلی تھی۔ میری بدقسمتی کہ نواب صاحب سے اس ملاقات کی تفصیل معلوم نہ کر سکا۔

لیکن نوابزادہ راشد علی نے جو نواب مظفّر کے ساتھ "سن" گئے تھے جی ایم سیّد سے ملاقاتوں کا حال سُنایا۔ انہوں نے بتایا کہ فروری ۱۹۸۰ء میں پہلی ملاقات کا محرّک خود نواب صاحب کا وہ خط تھا جو انہوں نے جی ایم سیّد اور چند دیگر سندھی رہنماؤں کو تحریر کیا تھا۔ اس خط میں انہوں نے لکھا تھا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ ہمیں جذباتیت اور انتہاپسندی کو ترک کر کے سندھ کی بھلائی کے لیے مل کر سوچنا چاہیے۔ جی ایم سیّد نے جواب میں لکھا کہ میں آپ کو اپنے گھر پر ہمیشہ خیر مقدم کہوں گا۔ اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ میں نظربندی کے سبب خود حاضر نہیں ہو سکتا لہٰذا ابھی آپ ہی تکلیف کریں۔

نواب مظفّر اس خط کو لے کر گورنر سندھ کے پاس گئے اور اجازت چاہی کہ انہیں جی ایم سیّد سے ملنے اور مفاہمت کی بات چیت آگے بڑھانے کا موقع فراہم کیا جائے۔

گورنر نے نواب صاحب کے جذبے کی تعریف کی اور بات صدر پاکستان تک پہنچائی گئی جنہوں نے خوشی کا اظہار کیا اور نیک تمناؤں کا پیغام بھیجا۔ "او کے" کا یہ سگنل ملنے کے بعد نواب صاحب فروری ۱۹۸۰ء کی ایک صبح "سن" جا پہنچے۔ جی ایم سیّد گھر سے باہر پھولوں کے ہار لیے کھڑے تھے۔ اس ملاقات میں ابتداً جناب سیّد بولتے رہے اور تین گھنٹے تک نواب صاحب اُن کی پرانی یادوں کے تذکرے، گلے شکوے سب کچھ سنتے رہے۔ کھانے کے بعد نواب صاحب نے اپنی معروضات پیش کیں۔ دلوں کے بند کواڑ کھلے تو طے پایا کہ مفاہمت کا فارمولا وضع کیا جائے اور دونوں صاحبان اپنے اپنے ساتھیوں سے تبادلہ خیال کریں۔ تقریباً ۲۰ دن بعد جو دوسری ملاقات ہوئی اس میں فارمولے کے مسوّدات کا تبادلہ کیا گیا۔ خاصا اچھا ماحول پیدا ہو چکا تھا، لیکن نواب صاحب کو ان کی صحت نے اجازت نہ دی۔ علاج کے لیے لندن گئے تو جولائی ۱۹۸۰ء میں نواب صاحب کو جی ایم سیّد کا محبّت بھرا خط ملا۔ اب دیکھیں محبّت کے اس پودے کا پھل سندھ کے لوگوں کو کب ملتا ہے۔

۱۹۷۹ء میں بلدیاتی انتخابات کے بعد نواب مظفّر نے جماعت اسلامی سے مارچ ۱۹۷۷ء کے انتخابات کا انتقام اس طرح لیا کہ وصی مظہر ندوی کو میئر بنوا دیا۔ بعدازاں ایک نشست سے خود نواب صاحب بھی کونسلر ہو گئے۔ ۳۵ سول لائنز کے ایک مرید کے بقول نواب مظفر کہتے تھے کہ جماعت اسلامی کے گٹر کو میں نے ندوی جیسے مضبوط ڈھکن کے ذریعہ بند کر دیا ہے۔ حقیقتاً انہوں نے جماعت اسلامی کو ایک ایسی سیاست کے لیے مجبور کر دیا تھا جس میں انتقام کی آگ اپنوں کا بدن ہی جھلسا دیتی ہے۔

مولانا ندوی جس انداز سے اُبھر رہے تھے اور ۳۵ سول لائنز سے ان کا رابطہ جس انداز سے قائم تھا، اس سے توقع کی جا رہی تھی کہ نواب مظفّر کے جانشین یہی ہوں گے، مگر نواب مظفّر کی موت کے بعد جب ان کی نشست سے ان کے بیٹے نوابزادہ راشد کونسلر ہوئے تو تھوڑے ہی عرصے بعد مولانا ندوی اور نواب مظفّر کے حامیوں میں چل گئی اور ہر فریق ایک دوسرے کی صورت دیکھنے کا روادار نہ رہا۔

نواب مظفّر کے انتقال پر میں نے "جسارت" کی ۷ جنوری ۱۹۸۱ء کی اشاعت میں جو ڈائری قلم بند کی، اُس کے آخر میں لکھا تھا کہ، اُن کے احباب میں سیاسی کارکن تو بہت

ہیں، مگران کا جانشین کوئی نہیں بن سکا۔" یہ بات آج بھی صحیح ہے، اور شاید مستقبل بھی اسے رد نہ کر سکے۔

یہاں اپنی وہی ڈائری پیشِ خدمت ہے۔

"نواب مظفّر حسین خان ۳۰ دسمبر کو انتقال کر گئے یوں سال ۱۹۸۰ء جاتے جاتے ہم سے ایک اور شخصیت چھین کر لے گیا۔

مونچھوں پر تاؤ دے کر رُعب اور دبدبے کے ساتھ ۲۰ سال تک ہنگامہ خیز اور متنازعہ سیاسی زندگی گزارنے والے نواب مظفّر کی موت بلاشبہ سیاسی زندگی کے ایک جُداگانہ باب کا اختتام ہے

۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۵ء تک خصوصاً نواب مظفّر کی سیاسی زندگی کچھ اس طرح گزری کہ جہاں انہیں ہدف تنقید اور ناپسندیدگی کا نشانہ بننا پڑا وہیں انہیں چاہنے والوں کی کمی بھی نہ رہی۔ وہ بہت سے افراد کی محبتوں کا نشان بھی رہے ہے۔ وہ منفی سوچ کے لوگوں کے لیے یقیناً منفی انداز کا چیلنج تھے لیکن بہت کم لوگ یہ بات جانتے ہوں گے کہ وہ ایک دردمند دل رکھنے والے انسان تھے۔

اور شاید یہ بات بھی ان کے حلقۂ احباب کے سوا کسی کو معلوم نہ ہو کہ ان کے ملازم خاص کی حیثیت بدین کے ایک نوعمر لڑکے کو حاصل تھی جو اب ۳۲ سال کا جوان ہے اور ۲۰ سال تک نواب صاحب کی مسلسل خدمت کرنے کے بعد اس گھر کا ایک فرد بن گیا ہے۔ "محمّد عرس سومرو" کو نواب مظفر دس سال کی عمر میں بدین سے لائے تھے۔ جہاں اُن کی زرعی زمین ہے۔

نواب مظفّر جو نرم دل ہونے کے باوجود سیاسی زندگی میں اٹل فیصلوں کے قائل تھے، اور "دُھن کے پکّے" بھی۔ متنازعہ سیاست میں کس طرح اُلجھے' یہ ایک ایسی داستان ہے جس کی جزئیات کو الگ الگ کر کے اور کھول کر بیان کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ نواب صاحب سوائے اس کے کہ "رَدِعمل" کا شکار ہوئے اور کوئی بات نہ تھی۔ انہیں اپنی زندگی میں بھی اس بات کا احساس تھا کہ "رَدِعمل" کی سیاست پائیدار نہیں ہے، اور مجھے اچھی طرح سے یاد ہے کہ ۱۹۷۳ء ہی میں وہ "قومیتوں" کے نام پر بننے والے محاذ سے بحسن وخوبی چھٹکارا چاہتے تھے۔ اس کا اندازہ نواب صاحب کے ان خیالات سے ہوتا تھا جو وہ صحافیوں سے

نجی محفلوں میں کرتے تھے۔ ایک بار انہوں نے صحافیوں سے کہا تھا کہ اگر آپ کو اس محاذ کا نام پسند نہیں تو آپ ہی کوئی اور نام تجویز کریں، جس سے قومی ہم آہنگی کا اظہار ہو۔ بہر حال نواب مظفّر کو یہ موقع یکم جنوری ۱۹۷۶ء کو ملا جب انہوں نے پیر صاحب پگاڑو کے ہاتھ میں ہاتھ دے دیا اور ۳۵ سول لائن میں ایک پُر تکلف ظہرانے میں قومیتوں کے محاذ سے وہ اسی قومی جماعت کی طرف پلٹ آئے جس سے ان کی پرانی یادیں وابستہ تھیں۔

نواب مظفّر ان شخصیات میں سے تھے جنہیں کسی سطح پر تعارف کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ وہ میونسپل کونسل کے مختصر سے حلقۂ انتخاب سے لے کر صوبائی اور قومی اسمبلی کے وسیع حلقۂ انتخاب تک ایک اچھے اُمیدوار تھے، اسی طرح جہاں وہ شہر اور پھر صوبے میں جانے پہچانے تھے وہیں ملک گیر سطح پر ان کا نام اجنبی نہیں تھا۔

نواب مظفّر نے تقریباً ایک سال قبل سندھ کے بزرگ سیاستدان جی ایم سیّد سے ان کے گھر جا کر ملاقات کی تھی۔ اس ملاقات کا احوال خود نواب صاحب نے راقم کو چیدہ چیدہ سنایا تھا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ اب گرد و غبار چھٹنے کے بعد جذبات کی آندھی گزر جانے کے بعد جنابِ سید بھی وہی سوچ رہے ہیں جو میرے دل نے سوچا ہے، مگر بد قسمتی یہ ہے کہ اس موضوع پر ہم نواب مظفّر کے دل کو پوری طرح وا نہ کر سکے، اور نہ جانے ایسی کتنی ملاقاتوں کے راز لیے ان کا دل ہمیشہ کے لیے دھڑکن بھول گیا۔

نواب مظفّر کی ایک خوبی یہ بھی تھی کہ انہوں نے نوکر شاہی کے کل پُرزوں کو ہمیشہ فاصلے پر رکھا اور جب کبھی ان سے بات کی، گھن گرج کو کم نہ ہونے دیا۔ وہ کسی کی سفارش برائے سفارش نہ کرتے تھے۔ بلکہ اگر وہ کسی افسر سے کسی نوجوان کو ملازمت دینے کے لیے کہتے تو اس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ ملازمت ضرور ملے گی، اور کسی تھانیدار سے کسی اسیر کی رہائی کے لیے کہتے تو یہاں بھی انکار بہت کم سنتے تھے۔

میری ڈائریوں اور تحریروں سے نواب مظفّر کبھی کبھی ناراض بھی ہوئے بلکہ ان کی اور ان کے رفقا کی رضامندی اور خوشی کے مقابلے میں ناراضگی کی شرح زیادہ ہی ہوگی۔ لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں میرے لیے جو شفقت اور محبّت اور احترام تھا اسے میں نہیں بھول سکتا۔ جب کبھی فون کیا دوسری جانب ایک مانوس

آواز نے خیر مقدم کیا۔ انہوں نے بارہا کہا کہ "میں تمہیں اپنے بچّوں کی طرح سمجھتا ہوں۔ پوچھو کیا پوچھنا ہے۔"

رمضان المبارک کا مہینہ آتا تو صحافیوں کو ۲۷ ویں روزے کے دن باالتزام افطار کے لیے بلاتے اور خاص قسم کے میٹھے اور نمکین پکوان سے تواضع کرتے۔ برسوں سے ان کی یہ روایت چلی آ رہی تھی۔

ذیابیطس کا مریض ہونے کے باعث خود ان کے لیے میٹھا ممنوع تھا لیکن ہمیشہ اس کی خلاف ورزی کرتے مجھے بتاتے کہ تمہارے دوست اور میرے معالج ڈاکٹر فاروق نے سختی سے ناشتہ میں حلوہ منع کیا ہے۔ مگر مجھ سے یہ پرہیز نہیں ہوتا۔ ملازم کے بقول جب سے ناشتہ میں حلوہ بند ہوا تھا طبیعت ٹھیک ہونے کے بجائے پرہیز کی پابندیوں کے سبب اور خراب ہو گئی تھی۔

وہ یکم جولائی کو علاج کے لیے لندن گئے۔ لیکن معالجین کی تبدیلی بھی ان کے لیے صحت کی بحالی کا پیغام نہ لا سکی، اور ۲۳ دسمبر کو وطن واپس آنے کے بعد وہ کمبائنڈ ملٹری اسپتال میں داخل ہو گئے۔ جہاں انہوں نے اپنی زندگی کا آخری ہفتہ گزارا۔

نواب مظفؔر کے انتقال کے بعد جنازہ اٹھائے جانے سے قبل جب ان کے تمام پرانے اور نئے احباب ۲۵ سول لائنز میں جمع تھے تو رفیق درباری نے حسرت کے ساتھ کہا۔ یہ اس بنگلہ کا آخری اجتماع ہے۔ مگر سوگوار اجتماع۔

گذشتہ سال بلدیاتی نمائندوں کی کتاب کی تیاری کے وقت ایک اخبار نویس اور راقم نے خود نواب صاحب کی قابلِ رشک یادداشتوں کی مدد سے ان کی زندگی کا جو خاکہ مرتب کیا وہ ان کا آخری انٹرویو کہا جا سکتا ہے اس خاکے نے ان کے انتقال کے وقت نصف درجن سے زائد اخبار نویسوں کی مدد کی اور وہ جان سکے کہ ہندوستان کی ریاست دان پور (ضلع بلند شہر) میں حضرت مجدؔد الف ثانی کے ہاتھوں مسلمان ہونے والے نواب مظفؔر حسین کے گھرانے میں ۲۳ اپریل ۱۹۲۱ء کو جو پہلا بیٹا پیدا ہوا وہ نواب مظفؔر حسین خان کہلایا۔ مسلمان ہونے سے قبل اس خاندان کا تعلق جے پور کے حکمران اور دلّی کے بادشاہ پرتھوی راج کی بہن سے بھی جڑتا ہے۔

۶۰ سال کی عمر میں اکلوتے بیٹے راشد علی، دو صاحبزادیوں اور ایک بیوہ کو سوگوار چھوڑ کر

دارِ فانی سے کوچ کرنے والے نواب صاحب غیر معمولی یادداشت کے ساتھ اور تاریخ کے حوالوں سے گفتگو کرنے کے عادی تھے۔

علی گڑھ سے بی ایس سی کرنے والے اس نواب نے جو نوابی ٹھاٹھ باٹ کو چھوڑنے کے لیے کسی لمحہ تیار نہ تھے، آبائی پیشہ زمینداری اختیار کرنے کے بجائے پہلے قیامِ پاکستان کے لیے پھر استحکام پاکستان کے لیے سیاست کے میدانِ خارزار کو چُنا۔ ایک بار ہندوستان میں اور دو بار پاکستان میں جیل کی صعوبت جھیلی۔

نواب صاحب جن دنوں سندھ اسمبلی کے رکن تھے تو بہت سی داستانیں سُنایا کرتے تھے۔ ان کی باتیں بند قباؤں کو کھول دیتی تھیں۔ یہ باتیں آج بھی ان کہی داستانوں کا حصّہ ہیں۔ افسوس یہ ہے کہ وہ از خود کوئی یادداشت مرتّب نہ کر سکے۔

نواب صاحب کی ایک خوبی اور بھی تھی کہ وہ یہ جانتے ہوئے کہ میری جیب میں کھوٹے سکّے ہیں، ان کا استعمال خوب جانتے تھے۔ ان کھوٹے سکّوں کی بھدّی آوازوں کو انہوں نے سچّے سکّوں کی کھنکتی آوازوں میں بدل دیا تھا۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ان کے احباب میں سیاسی کارکن تو بہت ہیں مگر کوئی ان کا جانشین نہیں بن سکا۔ اور آئندہ بھی کوئی توقع نہیں کہ ان کی کمی پوری ہو سکے۔

وہ ایک ایسی سیاست کے لیے مجبور تھے جہاں ساری بات ایک شخصیت کے گرد گھومتی ہے اور وہیں ختم ہو جاتی ہے۔

S A N N

Dated:- 17.7.1980

My Dear Nawab Sahib.

I have come to know today that on account of bad health you have left for england. I have some how managed to get your address amd I am sending you this letter for inquiring about your health, I hope by the grace of God, you are know hale and hearity and hope to see you once again back in Sindh.

Yours Sincerely

G. M. Sayed

(G.M. SYED)

نواب مظفر کے نام جی ایم سید کا محبت بھرا خط
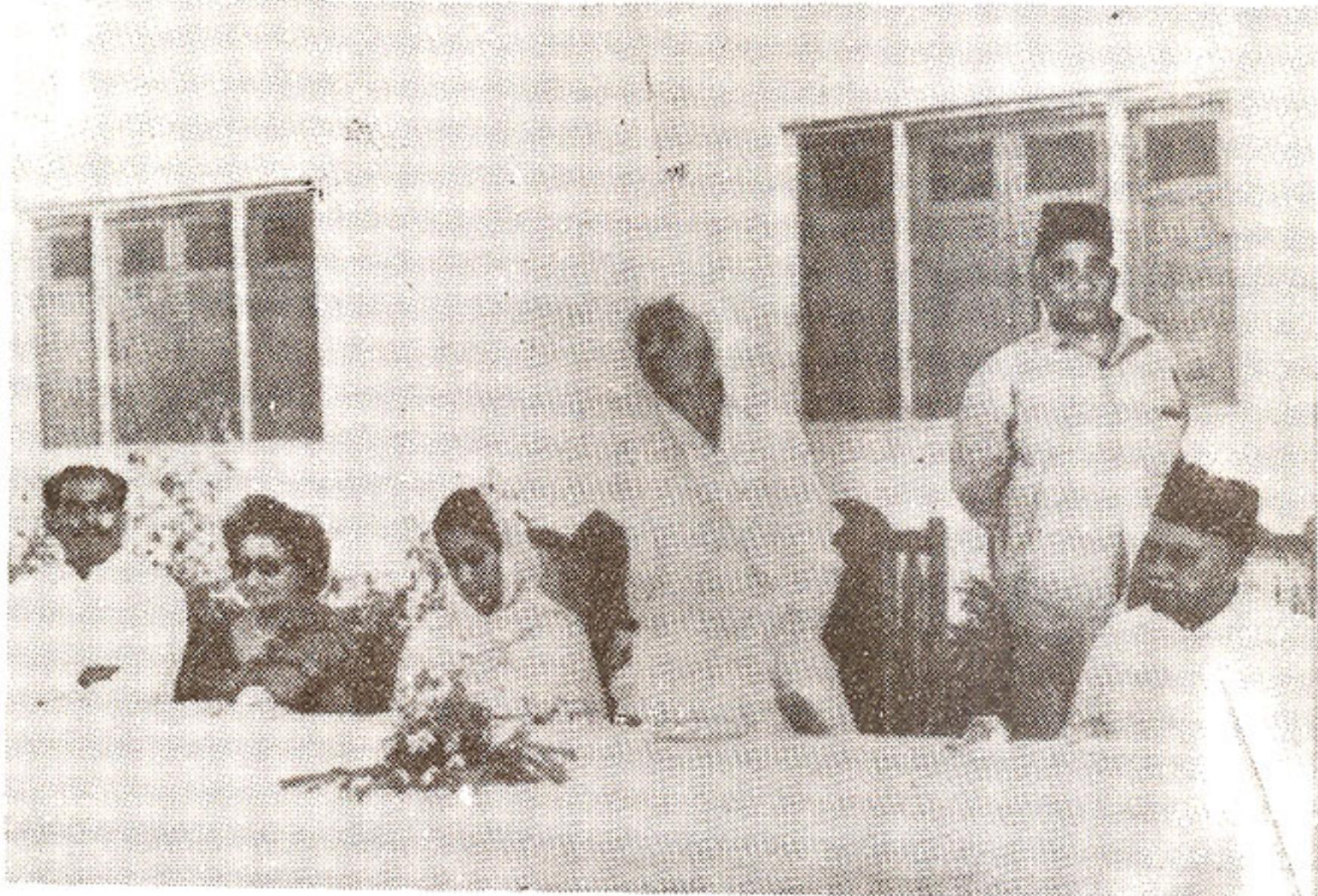
پاکستان کی جمہوری تاریخ کے سب سے عظیم کردار مادرِ ملت محترمہ فاطمہ جناح کے ہمراہ ایک استقبالیہ میں انتہائی دائیں جانب خواجہ ناظم الدین ہیں جب کہ نواب مظفرؒ حسین انتہائی بائیں جانب بیٹھے ہیں۔ (جنوری ۱۹۶۴ء)

نواب مظفرؒ حسین قومی اتحاد کے جلسہ عام میں مولانا مفتی محمود اور شیرباز مزاری کے ساتھ۔
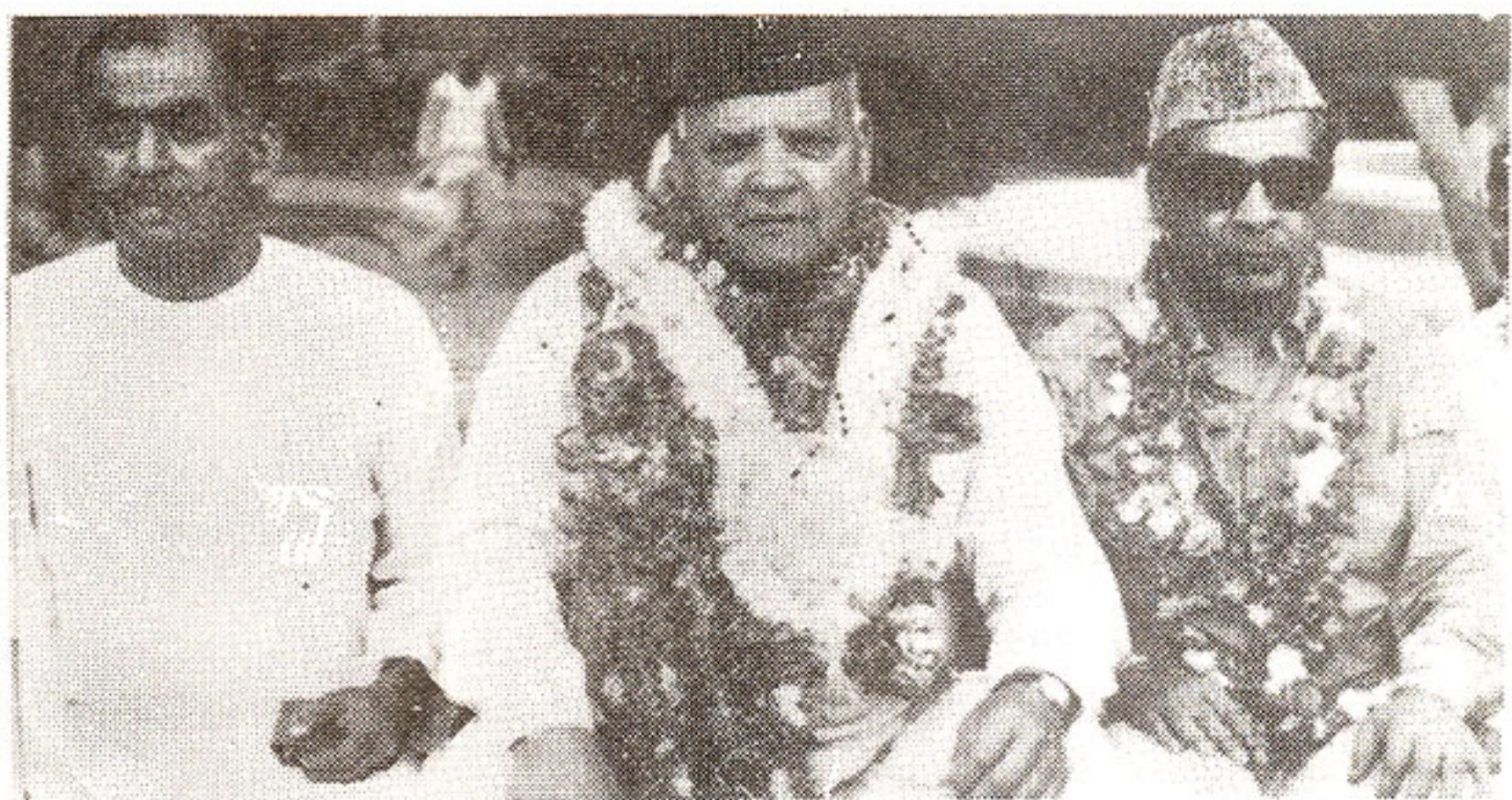
نواب مظفرؒ حسین ، خان قیومؒ اور حسن محمود بیگ کے ہمراہ
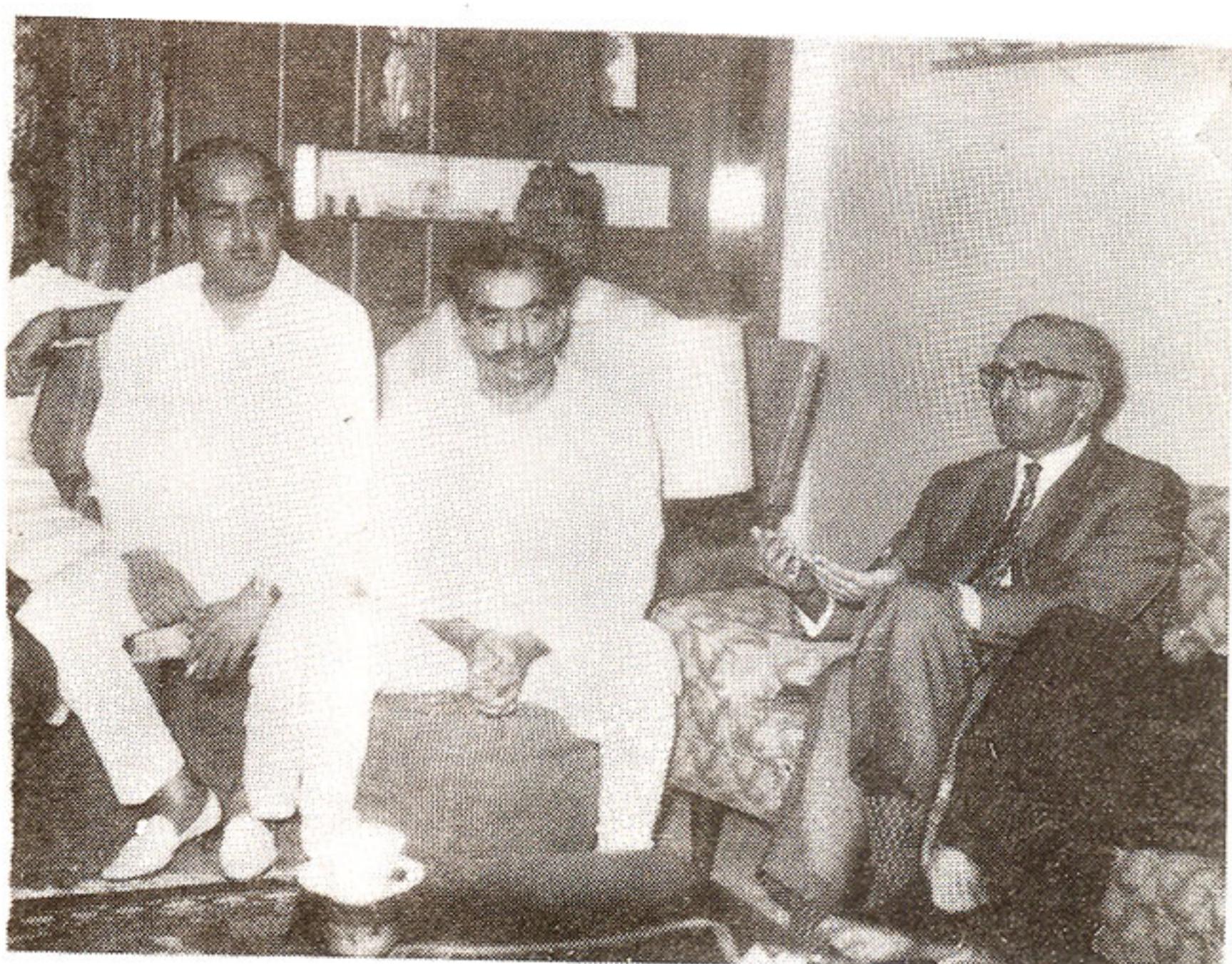
نواب مظفرؒ حسین اور میاں ممتاز دولتانہ
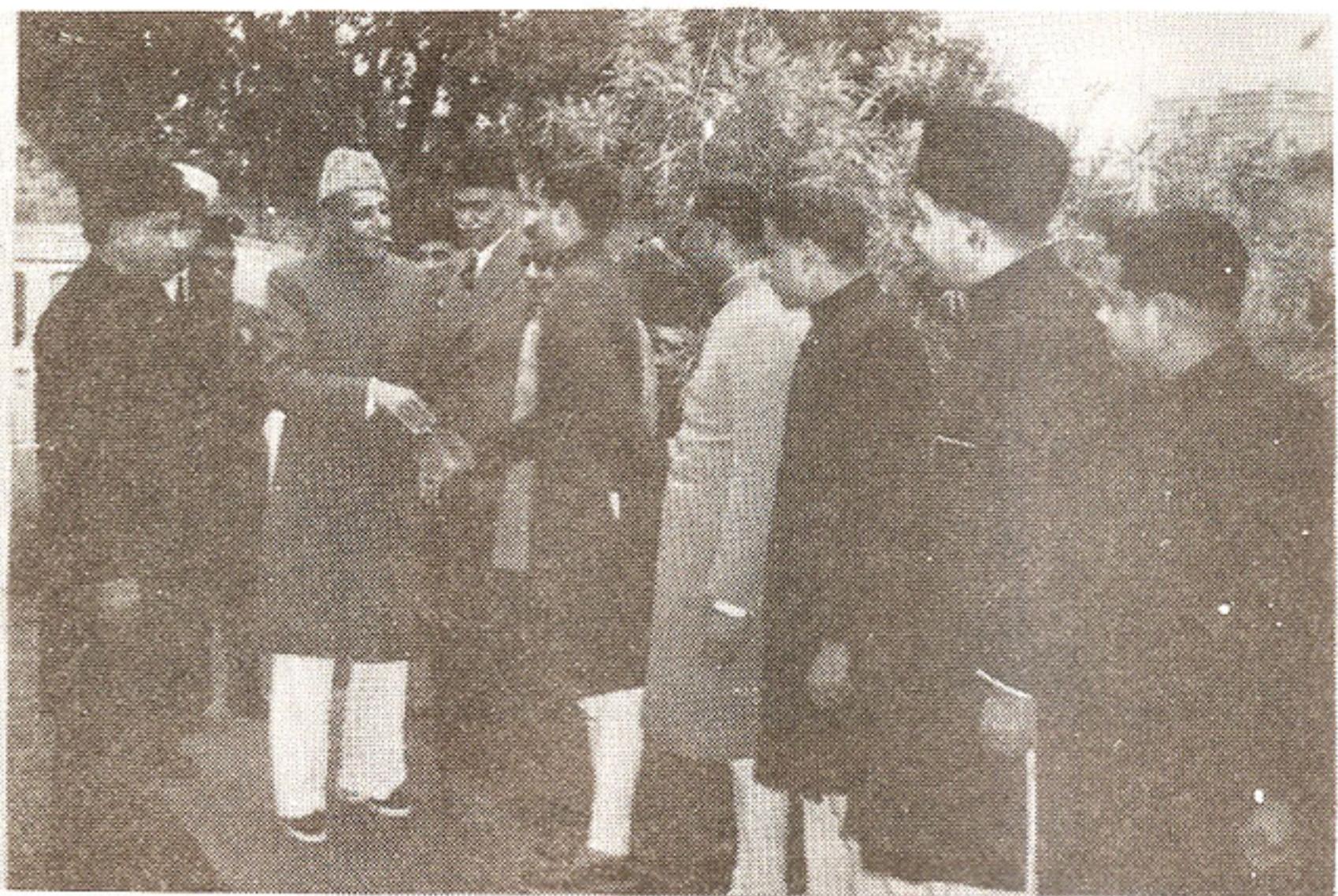
نواب مظفرؒ حسین پاکستان کی جمہوری تاریخ کے رسوا کن کردار گورنر جنرل غلام محمدؒ
سے ہاتھ ملاتے ہوئے قاضی اکبر عمائدین کا تعارف کرا رہے ہیں۔
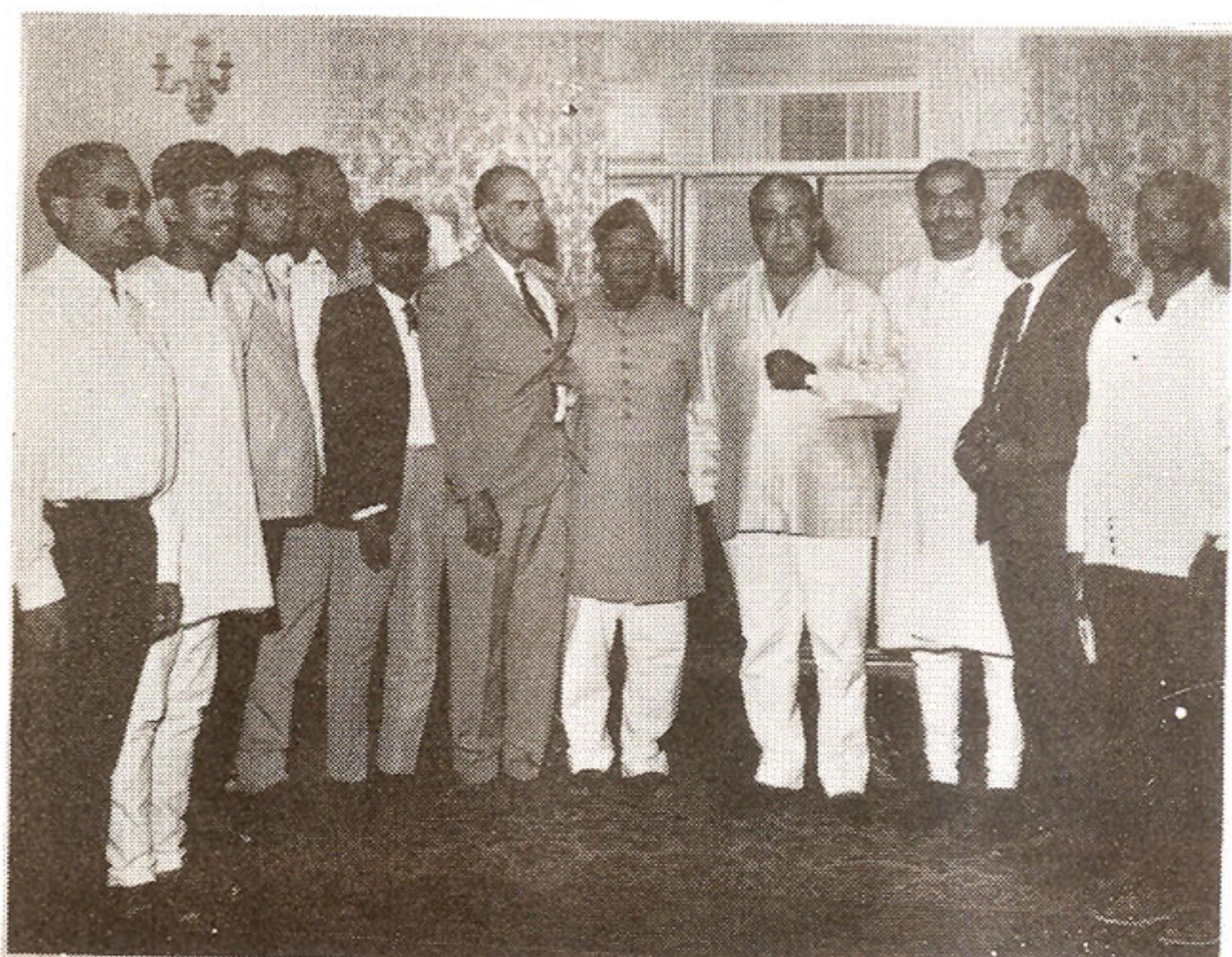
یحییٰ خان سے ملاقات کے وقت جب پاکستان کی قسمت اُس کی مٹھی میں تھی، نواب مظفرؒ دائیں سے تیسرے

ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد کے دوران نواب مظفر حسین شہید وطن مولوی فرید احمد اور ائیر مارشل اصغر خان کا استقبال کرتے ہوئے، تصویر میں ممتاز بھٹو اور نجم الدین سرپوال بھی نمایاں ہیں

ایوبی آمریت کے خلاف جدوجہد، ائیر مارشل اصغر خان کا استقبالیہ جلوس نواب مظفر حسین اور نجم الدین سرپوال نمایاں ہیں۔
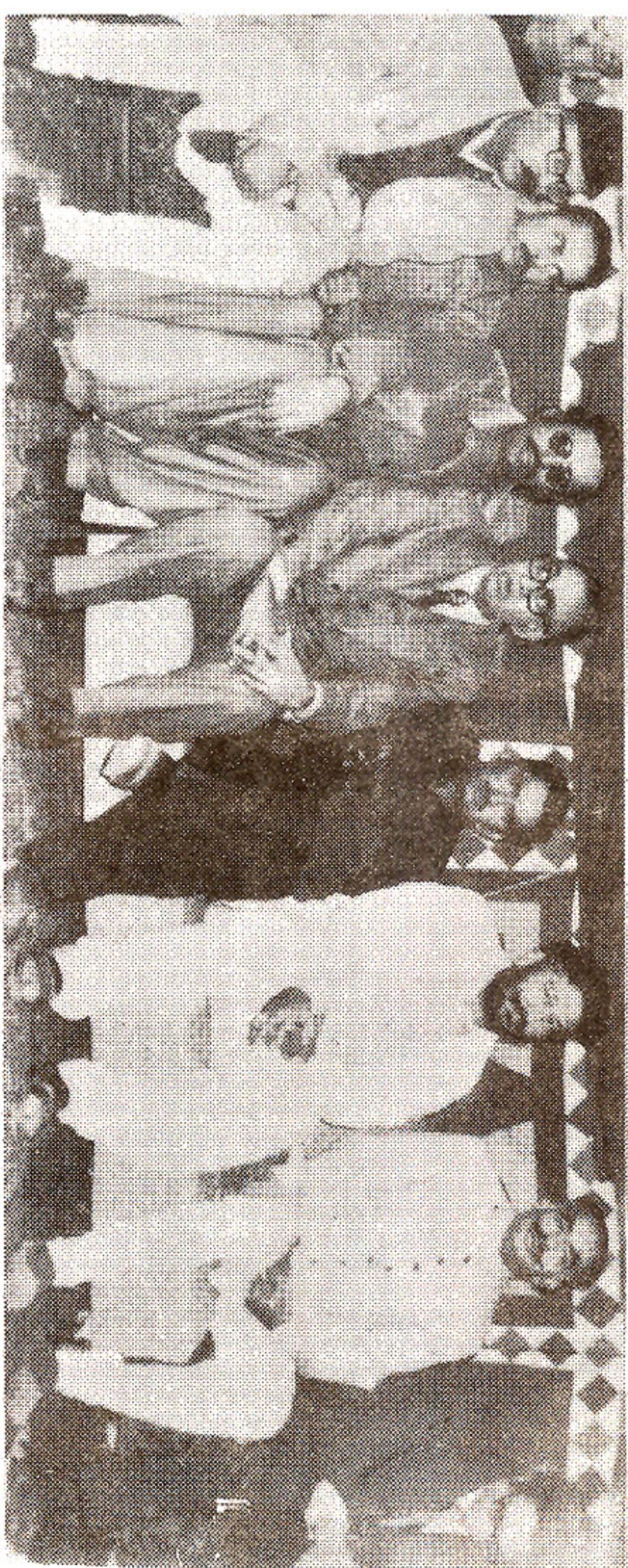
نواب مظفر جبین، پیر پگاڑو کی دعوت پر مسلم لیگ میں شمولیت کے موقع پر پیر پگاڑو، حنیف رامے، مصطفےٰ کھر، رانا خداداد، ذوالفقار جاموٹ، بوستان علی ہوتی اور نواب یامین کے ہمراہ۔

نواب یامین کی قیام گاہ پر خان قیوم کی موجودگی میں نواب مظفر حسین
کا خطاب قاضی محمد اکبر حکیم شاہد علی اور سید بدر حیدر نمایاں ہیں ۔
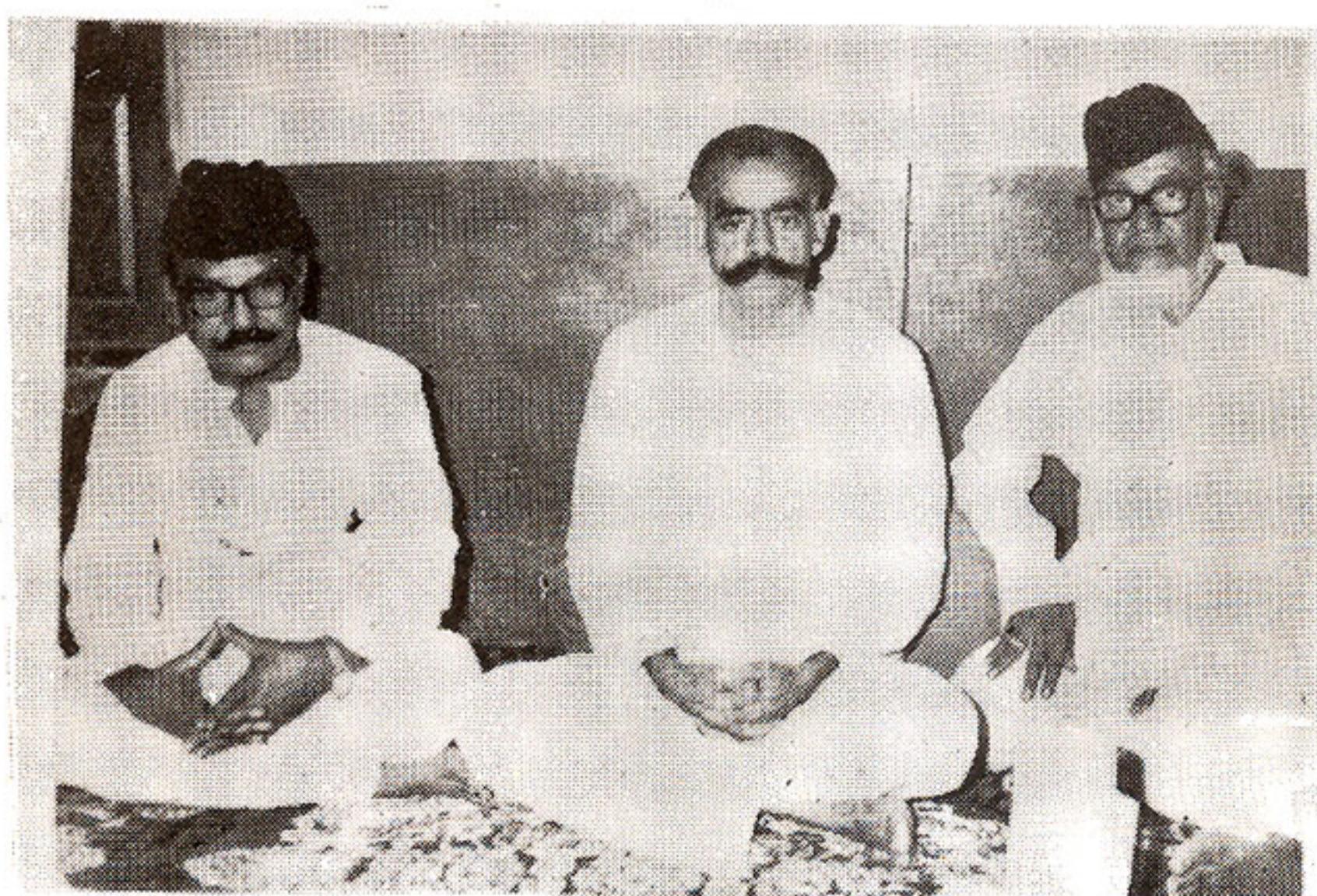
نواب مظفرؒ حسین اور نواب یامین آپس میں تجدید دوستی کے
وقت حکیم شاہد علی کے ہمراہ ان کی رہائش گاہ پر

نواب مظفرؒ حسین چودھری ظہور الٰہی کے ہمراہ جب وہ وفاقی وزیر ہوئے۔
ساتھ میں نسیم الرحمٰن صدیقی، غوث علی شاہ اور ہارون احمد ہیں۔
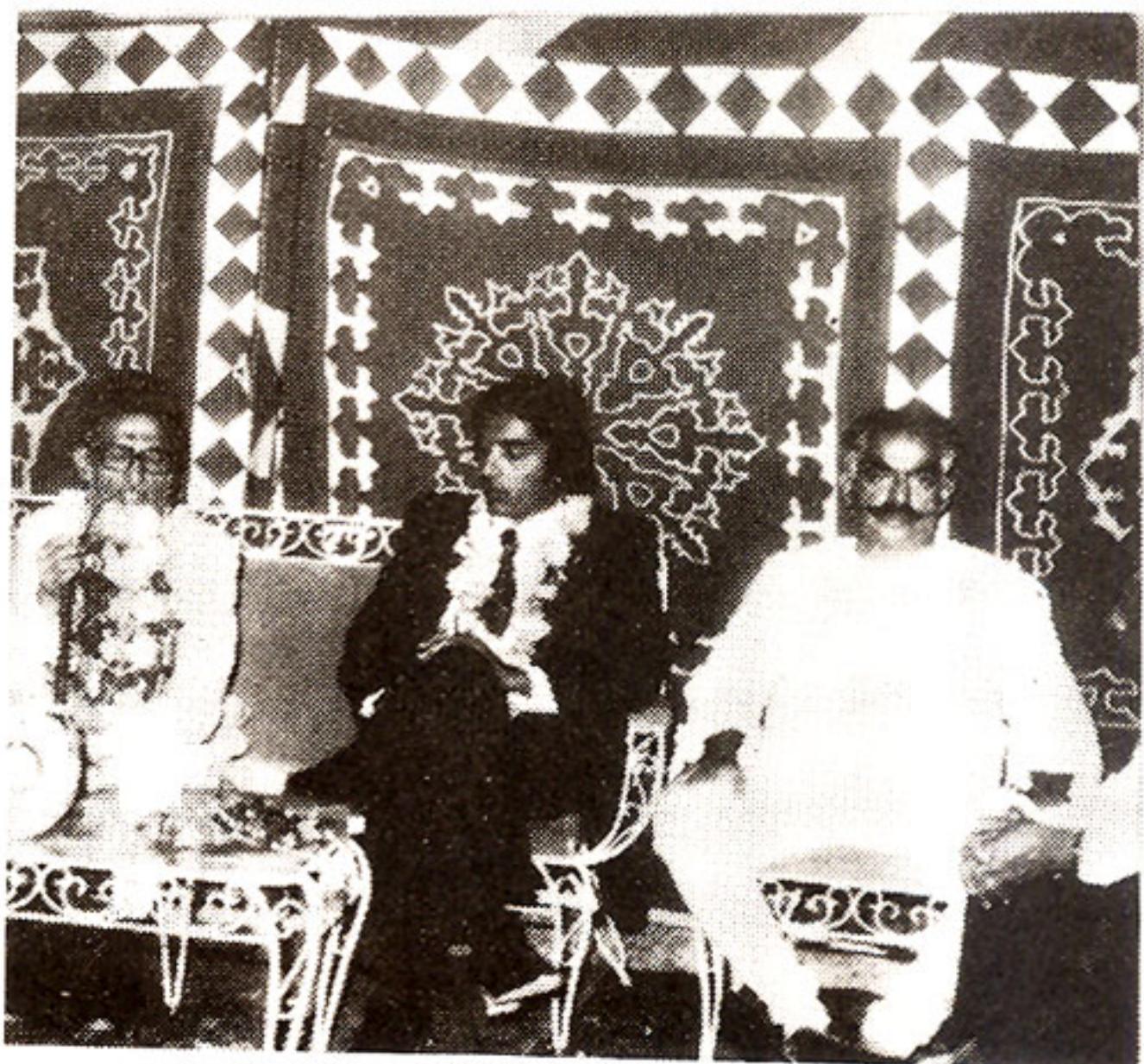
مولانا ندوی اور بشیر چانڈیو کو بالترتیب میئر اور ڈپٹی میئر بنوانے والے
"بادشاہ گر" کی حیثیت سے نواب مظفر حسین آخری یادگار تصویروں میں سے ایک تصویر

۱۹۱۴ء نرہر شریف، ریاست جے پور
۰۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء حیدر آباد

حافظ مبارک علی شاہ

ابھی مجھے صحافت کی دنیا میں قدم رکھے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا کہ حافظ مبارک علی شاہ اس جہانِ فانی سے رخصت ہو گئے۔ تاہم مجھے ان سے ملنے، قریب سے دیکھنے اور مائیک پر سننے کا موقع کئی بار ملا۔

مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ تقریباً چوتھائی صدی تک حیدر آباد میں ان کی سیاست کا طوطی بولتا رہا۔ ان کی سیاست کا مرکز "موتی محل" جو ان کی موت کے بعد سچ مچ کا بھٹیار خانہ بن گیا، چوٹی کے سیاست دانوں، ادیبوں، شاعروں اور حاکموں کی اجتماعی قیام گاہ رہا۔

مرحوم بلا کے ذہین اور قیامت کے خطیب تھے۔ وقت کے حکمرانوں اور سیاست دانوں سے ان کی دوستیاں اس قدر ضرب المثل بن گئی تھیں کہ یار لوگوں نے لطائف تک گھڑ لیے تھے۔

ان لطائف سے قطع نظر کہ زندگی ہنسی اور غم دونوں کے امتزاج کا نام ہے، حافظ صاحب جعفری خاندان کی آبرو تھے۔ ان کے بعد اس خاندان میں جس کے نفوس کی تعداد سینکڑوں میں ہے، نہ کوئی ایسا فرد پیدا ہوا اور نہ ہی ان جیسی ہمہ جہت شخصیت کا مالک بن سکا۔

ممتاز صحافی اقبال حامد نے حافظ مبارک علی شاہ کو قریب سے دیکھا اور پرکھا اور برسوں موتی محل میں حافظ صاحب کی رفاقت میں گزارے۔ وہ روزنامہ "جنگ" میں ان کی پانچویں برسی کے موقع پر لکھتے ہیں:-

"پاکستان کے اور شہروں کی طرح حیدر آباد میں بھی بہت سی مقتدر ہستیاں دفن ہیں، ان ہی میں ایک حافظ مبارک علی شاہ ہیں، جن کو رحلت کئے ۵ سال گزر گئے۔ یہ چونکہ سیاست دان تھے

اور اپنے نظریات رکھتے تھے اس لیے ان سے اختلافات رکھنے والے ان کی زندگی میں بھی تھے اور اب بھی ہو سکتے ہیں، لیکن حافظ مبارک علی شاہ میں بعض خصوصیات ایسی تھیں جن کا سب کو اعتراف رہا ہے۔ مثلاً یہ شیر خواری کے زمانے سے نابینا تھے، اس کے باوجود انہوں نے حفظ قرآن کے علاوہ اردو، انگریزی اور فارسی میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی۔

نئی نسل کے لیے اور ان کم ہمّت افراد کے لیے جو ذراسی معذوری کا بہانہ ملتے ہی بیٹھ رہتے ہیں، حافظ مبارک علی شاہ کی حصولِ علم کی لگن اور محنت ایک درس بن سکتی ہے، بالخصوص اس لیے کہ ۵۸ برس کی عمر میں انتقال کے وقت تک وہ حصول علم میں مشغول رہے اور غیر ممالک سے انہوں نے مختلف زبانوں کے اُبھرے ہوئے حروف منگوائے تھے۔

حافظ مبارک علی شاہ قیام پاکستان کے بعد اپنے وطن ریاست جے پور سے ہجرت کر کے حیدر آباد میں آباد ہوئے اور سندھ اسمبلی کے اولین انتخابات میں بڑی اکثریت سے منتخب ہوئے۔ ان کو وزیر اعلیٰ سندھ پیرزادہ عبدالستار نے مشیر آبادکاری مقرر کیا اور اس عہدہ پر انہوں نے قابلِ قدر کام بھی کیا۔ ان کا شمار اپنے وقت کے چند بہترین مقرروں میں ہوتا تھا، اس لیے ہر سیاسی جماعت اپنا اہم عہدہ ان کو پیش کرتی رہی، جب کہ مخالفین ان سے کترا کر نکل جانے میں ہی خیریت سمجھتے تھے، کیونکہ یہ بڑے کھرے، بیباک، بلکہ منہ پھٹ تھے، لگی لپٹی رکھے بغیر حقیقت کا اظہار برملا کر دیتے تھے۔ انکی تقریر میں بھی شعلہ بیانی، مزاح اور سچائی کے جوہر مضمر ہوتے تھے۔ اسی وجہ سے کسی جلسہ میں ان کا ہونا ہی کامیابی کی دلیل تھی۔

حافظ صاحب بلا کے خوددار اور غیور تھے اور اس خودداری نے ان کو اکثر بے پناہ مصائب میں مبتلا رکھا۔ بہر حال ان کو مایوس کبھی نہیں دیکھا گیا۔

حافظ مبارک علی شاہ یوں تو تمام مہاجرین کو خصوصاً اور تمام پاکستانیوں کو عام طور پر عزیز رکھتے تھے، لیکن خود ان کا طویل کنبہ ان کے ہمراہ تھا، جس کی کفالت اور ترقی کا منظہر نابینا حافظ مبارک علی شاہ کی واحد ذات تھی۔ چنانچہ خود ان کے افرادِ خاندان بلدیات اور ون یونٹ کی صوبائی اسمبلی میں منتخب ہوئے۔

حافظ صاحب مرحوم مدتوں مسلم لیگ حیدر آباد کے صدر رہے۔ آپ انجمن ترقی اردو کے صدر بھی تھے۔ ڈاکٹر عبدالحق نے ان کے علاوہ کسی کو انجمن ترقی اردو حیدر آباد کے صدر کی حیثیت سے قبول نہیں کیا، کیونکہ حافظ مبارک علی شاہ کو اردو سے والہانہ محبت تھی۔ حضرت جگر مراد آبادی، جناب حفیظ جالندھری، استاد قمر جلالوی اور درجنوں ممتاز شعرا کو ان سے اس قدر محبت اور عقیدت تھی کہ ان ہی کے ہاں مستقل قیام

کرتے تھے۔

سقوطِ ڈھاکہ کا حادثہ حافظ مبارک علی شاہ کے دل و دماغ اور صحت کو جھنجوڑ گیا۔ اس کے بعد لسانی فسادات نے ان کو سخت صدمہ پہنچایا اور ساتھ ہی اپنوں نے بھی ان کی روح پر گہرے زخم لگائے، بظاہر وہ ان سب آلام و مصائب کے سامنے سینہ تانے کھڑے نظر آتے تھے۔ مگر شاید اندر ہی اندر گھُل رہے تھے، بالآخر ۲ اکتوبر ۱۹۷۲ء کو وہ شخصیت اچانک اس دنیا سے رخصت ہوگئی، جس کی قابلیت اور ذہانت نے مسز سروجنی نائیڈو، راجگوپال اچاریہ، قائداعظم اور گاندھی جی سے بھی خراجِ تحسین وصول کیا تھا۔"

ممتاز سیاست دان اور مصنّف پیر علی محمد راشدی اپنے ہم عصر کے بارے میں ان کے انتقال کے فوراً بعد ۱۹۷۲ء میں روزنامہ "جنگ" میں لکھتے ہیں:۔

"ایک اور ساتھی اور مونس رخصت ہوگیا۔ حافظ سید مبارک علی شاہ مرحوم۔ ابھی ان کے رخصت ہونے کا وقت نہیں تھا۔ قبل از وقت بلاوا آگیا اور رختِ سفر باندھ کر روانہ ہوگئے۔ ان کی زندگی سبق آموز تھی۔ ایامِ طفلی میں بینائی جاتی رہی مگر عزم اور ہمت برقرار رہی۔"

"اگر پاکستان کے عشق میں مبتلا ہو کر وہ اس طرف کو نہ نکل آتے اور اپنی اصلی جگہ پر جمے رہتے تو آزاد ہندوستان کی سیاست میں بہت اوپر جاتے اور وہاں کی سیاسی تاریخ میں یہ نابینا سیاستدان اعلیٰ ترین مقام پاتے، بلکہ عجوبہ روزگار سمجھے جاتے۔ اصل بات یہ تھی کہ وہ ظاہری بینائی سے محروم تھے، مگر دل کی بینائی سے محروم نہیں تھے، اصل چیز دل کی بینائی ہوتی ہے انسان کا دل اندھا ہوجائے تو اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے؟"

"میں جانتا ہوں کہ بعد کے زمانے میں حافظ صاحب سے کچھ سیاسی لغزشیں بھی سرزد ہوئیں، مگر وہ لغزشیں ایسی نہیں تھیں جن کی علّت معلوم نہ ہوسکے۔ مثلاً جب قائداعظم والی مسلم لیگ مرگئی، تو حافظ صاحب نے ایوب خان والی لیگ کا علم تھام لیا تھا۔"

"قریبی زمانے میں سندھیوں کو یہ شکایت رہی کہ حافظ صاحب مہاجروں کے حامی اور اصل سندھیوں کے دشمن بن گئے تھے، مگر میں وثوق کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ یہ شکایت بے بنیاد تھی۔ وہ خود مہاجر تھے اور اس وجہ سے ان کی مہاجروں سے ہمدردی ایک نیچرل بات تھی، مگر مہاجروں سے ان کی ہمدردی کے یہ معنی ہوں کہ وہ سندھیوں سے دشمنی پر بھی آمادہ ہوجائیں، یہ بات ان کی فطرت کے خلاف تھی۔"

حافظ صاحب ریاست جے پور کے قصبہ زہر شریف میں ۱۹۱۴ء میں پیدا ہوئے۔ گیارھویں پشت میں

ان کا سلسلہ نسب حضرت سید احمد حاجب شکر بارؒ سے ملتا ہے، جن کی چوکھٹ اہل راجپوتانہ کے لیے فیوض و برکات کا آستانہ رہی ہے۔

انہوں نے ۹ برس کی عمر میں قرآن حفظ کیا اور اردو، فارسی اور عربی پر دسترس حاصل کی۔ ۱۹۳۳ء میں مولوی، ۱۹۳۴ء میں مولوی فاضل اور ۱۹۳۶ء میں میٹرک پاس کیا۔ ۱۹۳۸ء میں ادیب فاضل، ۱۹۳۹ء میں ایف اے اور ۱۹۴۱ء میں گریجویشن کیا۔

باوجود معذور ہونے کے انہوں نے تجارت کو ذریعہ معاش بنایا اور اس میدان میں نمایاں کامیابی حاصل کی، مثلاً جے پور بس سروس لمیٹڈ کے مینجنگ ڈائریکٹر اور راجپوتانہ ٹاکیز لمیٹڈ کے ڈائریکٹر وغیرہ رہے۔ ۱۹۴۲ء میں انہیں ریاستی مسلم لیگ کی عاملہ کا رکن منتخب کیا گیا۔ ۱۹۴۳ء سے قیام پاکستان تک آپ ریاست جے پور کی مجلس قانون ساز کے رکن رہے۔ آپ کو مسلم لیگ اسمبلی پارٹی کا ڈپٹی لیڈر بننے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔

قیام پاکستان کے بعد مہاجرین کی آبادکاری پر غور و خوض کے لیے جمعیت المہاجرین قائم کی اور حیدرآباد میں سہ روزہ آل پاکستان مہاجر کنونشن منعقد کیا، جس کی صدارت حسین شہید سہروردی نے کی۔

قائداعظمؒ نے مہاجرین کی آبادکاری کے لیے علامہ شبیر احمد عثمانیؒ کی زیر قیادت جو اعلیٰ اختیاراتی کمیٹی قائم کی، حافظ صاحب اس کے ممبر بھی رہے۔ حافظ صاحب جب ۱۹۵۳ء میں سندھ اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور انہیں حکومت سندھ کا مشیر مقرر کیا گیا تو انہوں نے صرف ایک روپیہ تنخواہ لینے کا اعلان کیا اور یوں عملی طور پہ اخلاص کا ثبوت دیا۔ حافظ صاحب کو یحییٰ خان کے دور میں لسانی منافرت پھیلانے کے الزام میں قید و بند کی صعوبت بھی اٹھانی پڑی۔

حافظ صاحب کو ممتاز اہل قلم اور شعراء کے علاوہ سیاست دانوں میں مس فاطمہ جناح، حسین شہید سہروردی، چودھری خلیق الزماں، ایوب خان، خان عبدالقیوم خاں، سردار عبدالرب نشتر، ممتاز دولتانہ، آئی آئی چندریگر، پیر پگاڑو، نواب افتخار حسین ممدوٹ، پیرزادہ عبدالستار، محمد ایوب کھوڑو، سید حسین امام، اصغر خاں، پیر علی محمد راشدی اور بہت سی شخصیات کی میزبانی کا شرف حاصل ہوا۔

حافظ صاحب کے بڑے بھائی ناصر علی شاہ مرحوم کے بیٹے اختر علی شاہ اردو روزنامہ "پاسبان" کے ایڈیٹر، پرنٹر اور پبلشر ہیں۔ ناصر علی شاہ سے چھوٹے باسط علی شاہ کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ جبکہ مظفر علی شاہ ابھی بقید حیات ہیں۔

مظفر علی شاہ سے چھوٹے حافظ مبارک علی شاہ تھے اور سب سے چھوٹے کے بی جعفر، جن کا اپریل ۸۰ء میں انتقال ہو گیا۔ کے بی جعفر نے حافظ صاحب کی تربیت اور رہنمائی میں سیاست میں کئی اہم عہدے حاصل کیے۔ مغربی پاکستان اسمبلی میں پارلیمینٹری سیکریٹری رہے، حافظ صاحب کے ساتھ کنونشن لیگ میں رہے،

بعد میں اصغر خاں کی جسٹس پارٹی میں شامل ہو گئے اور پیپلز پارٹی کے برسر اقتدار آنے کے بعد اس کے ہمنوا کہلائے۔

حافظ صاحب کی اہلیہ محترمہ بقید حیات ہیں۔ جب کہ دو بیٹوں یاور علی شاہ اور سید مطاہر جعفر میں سے اول الذکر بڑے صاحبزادے کی شادی ہو چکی ہے۔ دو بیٹیوں ریحانہ اطہر اور فرحانہ مبارک میں سے، فرحانہ ابھی غیر شادی شدہ ہیں۔

سابق مشرقی پاکستان کے رہنما عطاء الرحمن کے ہمراہ تین دوستوں تین ہمعصروں حافظ مبارک علی شاہ قاضی محمد اکبر اور میر رسول بخش تالپور کی یادگار تصویر

فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کے ہمراہ، حافظ مبارک علی شاہ کی ایک یادگار تصویر۔

حافظ مبارک علی شاہ، پیر صاحب پگارڈو کے ہمراہ جب ان کی گدی نشینی ہوئی
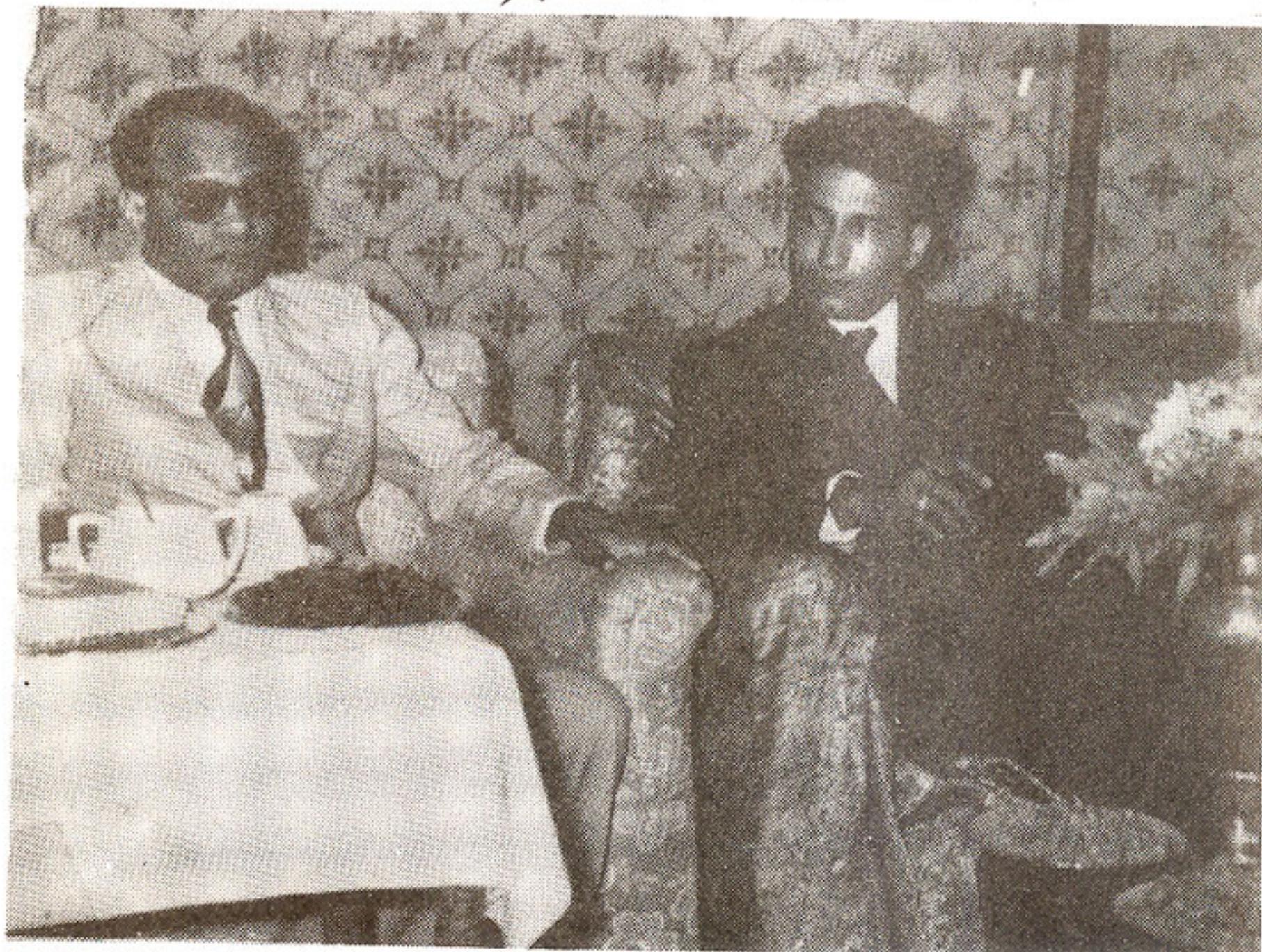
حافظ مُبارک علی شاہ اور نوجوان پیر پگاڑو

حافظ مُبارک علی شاہ تقریر کر رہے ہیں جبکہ نواب مظفر حسین گوش برآواز ہیں ۔
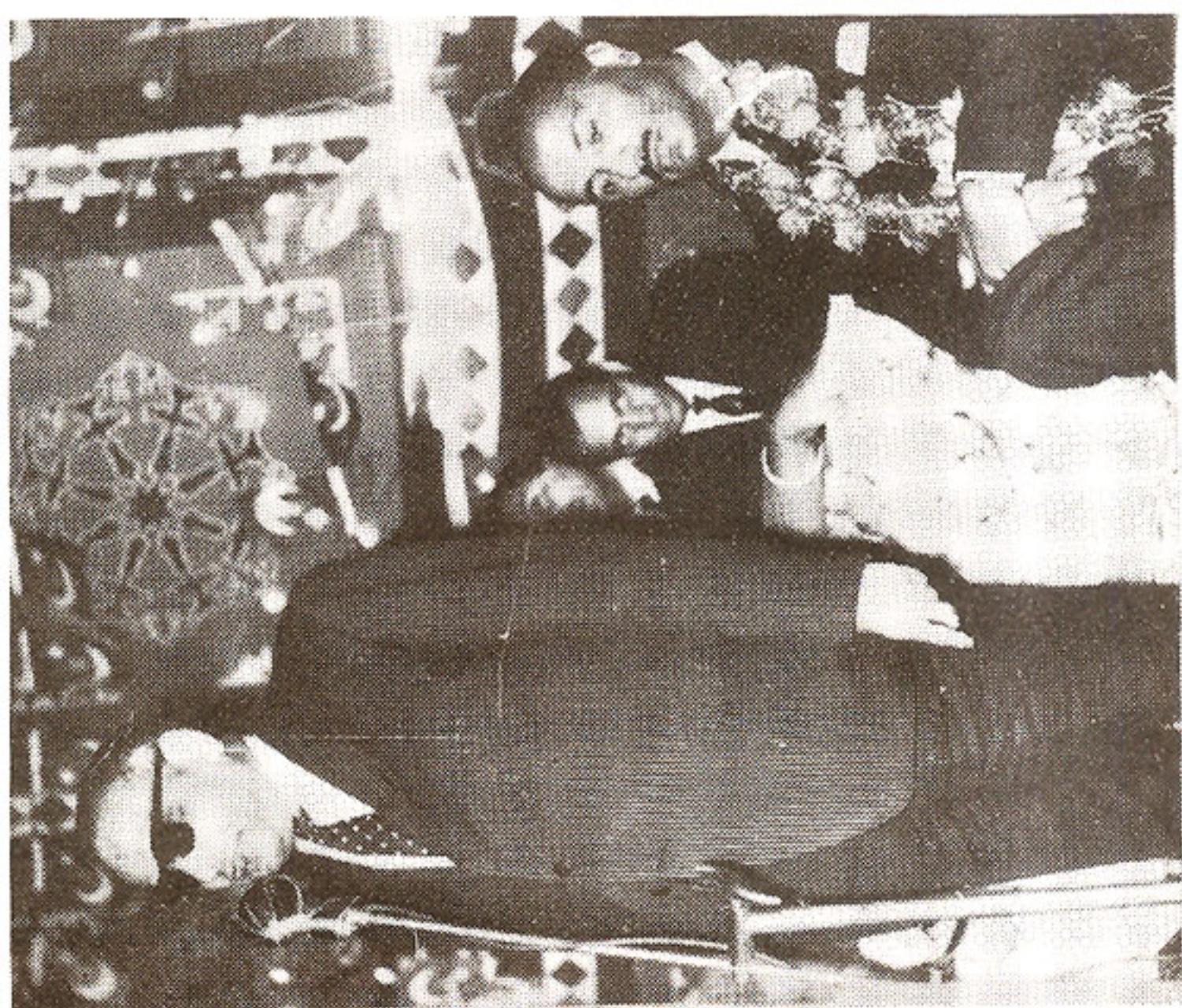
حافظ مُبارک علی شاہ کا خطاب ۔ اور ائیر مارشل اصغر خان کا انہماک

یکم جنوری ۱۹۰۴ء ہوشیار پور مشرقی پنجاب
۲۱، اپریل ۱۹۸۰ء حیدرآباد

ڈاکٹر محمد اسمٰعیل نامیؔ

مجھے زندگی بھر دو عظیم شخصیات کی موت کا صدمہ اس تعلق سے بھی رہے گا کہ میں مواقع میسر ہونے کے باوجود ان کی تہلکہ خیز زندگیوں کے حالات کو ان ہی کی زبانی سُن کر قلمبند نہ کرسکا۔ ان میں سے ایک ڈاکٹر محمدؒ اسماعیل نامی اور دوسرے میر رسول بخش تالپوُر ہیں۔

ڈاکٹر نامی ایسی ایسی داستانوں کے راوی اور چشم دید گواہ تھے کہ جن کی ہماری قومی تاریخ کو بھی ضرورت تھی۔ علامہ مشرقی کی باتیں، قائد اعظمؒ کے قصےؒ، بہادر یار جنگ کی کہانیاں، جی ایم سیّد، رئیس غلام محمدؒ بھرگڑی، قاضی اکبر اور میر علی احمد تالپور کے واقعات حفیظ جالندھری اور میاں محمد شفیع کی نیرنگیاں، غرض خاکسار تحریک سے تحریکِ پاکستان تک اور تحریکِ پاکستان سے قیامِ پاکستان تک ڈاکٹر نامی کے پاس واقعات ہی واقعات بکھرے پڑے تھے۔ شاید واقعات کے انبار ہی کے سبب میں اپنے اندر یہ ہمت نہ پاسکا کہ کہاں سے شروع کروں گا اور کہاں اختتام ہوگا۔ جب بھی انہوں نے پُرانی باتوں کا ذکر چھیڑا اور میں نے انہیں ترتیب وار لکھنے کی خواہش کا اظہار کیا تو شفقت سے کہا جب جی چاہے بیٹھ جانا، مگر میں تھا کہ ارادے باندھتا اور توڑتا ہی رہا اور ڈاکٹر صاحب ایسے بیمار ہوئے کہ مہلت ہی نہ مل سکی۔

ڈاکٹر نامی بیمار تھے تو مجھے یہ سوچ سوچ کر ہی ہول اُٹھتا تھا کہ کیا میرے ہاتھ سے یہ موقع نکل جائے گا کہ میں اس عظیم خاکسار کے حالاتِ زندگی قلمبند کرتے ہوئے جدوجہدِ آزادی کی تاریخ کو چھیڑ سکوں، کیا ڈاکٹر صاحب اتنے بھی صحت یاب ہو سکیں گے کہ مجھے اپنی اچھیؒ یادداشت کے ساتھ آپ بیتی سُنا سکیں، لیکن مجھے یہ موقع نہ مل سکا اور جب ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے

بعد میں نئے "بادبان" کے ۳۰ مئی ۱۹۸۰ء کے شمارے میں ڈائری لکھی تو آغاز ہی یہاں سے ہوا:
"اس خدشے نے میری ذہنی سرحدوں کا تعاقب پیر ۲۱ اپریل کی صبح سویرے مکمل کرلیا۔جس کا آغاز ڈاکٹر نامی کی شدید علالت کے وقت سے چند ماہ قبل ہوا تھا۔جب یہ اطلاع ملی کہ آج علی الصبح ڈاکٹر صاحب دارِفانی سے کوچ کر گئے ہیں تو یکایک ایسا لگا جیسے وہ خدشہ جسے میں اب تک دور دھکیلتا رہا تھا،ایک چھناکے کے ساتھ ذہنی سرحدوں کو عبور کرکے ہوش و خرد کی دنیا کو تہہ و بالا کر گیا ہے۔
بلا شبہ ڈاکٹر نامی ایک نامور انسان تھے جن کا حلقۂ احباب بہت وسیع تھا۔بقول میر رسول بخش تالپور کے،ان کے بیٹوں کے لیے اتنا ہی کہہ دینا تفصیلی تعارف ہے کہ وہ ڈاکٹر نامی کے بیٹے ہیں۔
آزادیِ وطن کی تاریخ کے حوالے سے بھی وہ ایک یادگار شخصیت تھے۔مگر ان سے میرا تعلق ان وجوہ کی بنا پر کم،اور ان کی اس بیش بہا شفقت اور محبّت کے سبب زیادہ تھا جو گزشتہ سات آٹھ سال سے مجھ پر رہی ہے اور یہ تعلقِ خاطر ایک ایسے رشتے اور ناطے کا نام بھی تھا جسے طمانیتِ قلب کہیں تو بے جا نہ ہوگا،میں سوچا کرتا تھا کہ شاید ان سے محبّت کا سبب یہ ہے کہ میں ان کے سب سے عزیز بیٹے کا دوست ہوں،یا پھر شاید اس لئے کہ میں نے ان ہی کے قائم کردہ اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی اور نامساعد حالات میں جینے کا راستہ نکالا۔لیکن میں کبھی اس سوچ کا تعیّن نہیں کرسکا۔میرے لیے ان کی محبت اسی طرح سرمایۂ جاں تھی،جیسے شہر کے نامور وکیل نامدار خان مرحوم کی شفقت عزیز تھی۔جب نامدار خان کا انتقال ہوا تو ایسا لگا تھا جیسے ایک حصار تھا جو گر گیا ہے،مگر ڈاکٹر نامی کی طرف دیکھ کر دل کو تسلّی ہوتی تھی کہ نہیں ابھی ایک فصیل باقی ہے۔
اب ان دونوں بزرگوں کے اُٹھ جانے کے بعد دل کیا محسوس کرتا ہے،اسے بیان کرنے کے لیے قلم و قرطاس پر قابو نہیں۔ڈاکٹر محمدؐ اسماعیل جو نامدار خان کی طرح اپنے پیشے میں نامور ہوئے تحریکِ آزادی کے نڈر سپاہی تھے۔خاکسار لیڈر کی حیثیت سے ان کی شہرت ہر سیاسی گوشے میں پہنچی،علامہ مشرقی نے اپنے اس دستِ راست کو "نامی بہادر" کے خطاب سے نوازا تھا۔
مشرقی پنجاب کے ضلع ہوشیارپور کے گھرانے سے تعلق رکھنے والے ڈاکٹر نامی یکم جنوری ۱۹۰۴ء کو ہوشیارپور ہی میں پیدا ہوئے۔لیکن انہوں نے اپنی ۷۷ سالہ زندگی کے آخری ۳۸ سال سندھ میں گزار دیے۔انہوں نے آزادی کے حصول کے لیے جب خاکسار تحریک کو اوڑھنا بچھونا بنایا تو

بہت سی صعوبتیں بھی جھیلیں، ہندوستان کے چپے چپے کا سفر بھی کیا۔ اور سینکڑوں ان کہی داستانوں کے رازداں بھی بنے۔ ڈاکٹر نامی کے لیے کیا یہی کم اعزاز کی بات تھی کہ وہ حصولِ آزادی کے وقت قائدِ اعظمؒ اور علامہ مشرقی کے درمیان ہونے والی تاریخی ملاقات میں موجود تیسرے فرد تھے۔ یہ ملاقات کیوں ناکام ہوئی۔ اور مسلمانانِ ہند کی تاریخ پر اس کے کیا اثرات مرتب ہوئے۔ ڈاکٹر نامی اس کی تمام جزئیات سے واقف تھے۔ وہ ایّامِ جوانی کے ایسے ایسے واقعات سُناتے تھے کہ انہیں ترتیب سے چھاپا جاتا تو بہت سے نامور افراد کے خدوخال واضح ہوجاتے — میری طرح کچھ اور صحافی ڈاکٹر صاحب سے یہ رسمی درخواست ہی کرتے رہ گئے کہ وہ اپنی یادداشتیں یا خود لکھیں، یا ہمیں لکھوا دیں۔ جب تقریباً دو سال قبل ایک شام پاکستان نیشنل سینٹر میں ڈاکٹر نامی نے پروفیسر کرار حسین کے اصرار پر جو ان کے بہت مداح رہے ہیں، تاریخ کے جھروکوں سے قائدِ اعظمؒ اور علامہ مشرقی کی ملاقات کے چیدہ چیدہ اوراق پلٹے تو دل میں اس خواہش نے پھر شدّت سے کروٹ لی کہ اب غفلت نہیں کرنی، یادداشت ضرور لکھنی ہے۔ خواہ وقت اجازت دے یا نہ دے۔ مگر وقت کے آگے ہماری محتاجی برقرار رہی اور چند ماہ قبل جب ڈاکٹر صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہوئی اور اسپتال میں انہوں نے مجھے ضعف کے باوجود پہچانتے ہوئے اپنا دستِ شفقت میرے دونوں ہاتھوں میں دے دیا، اور ڈبڈباتی آنکھوں کے ساتھ لکنت بھرے لہجے میں کچھ کہنا چاہا تو مجھے پہلی بار احساس ہوا کہ میں نے اپنی کج روی میں مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے نایاب اوراق کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا ہے۔ میں زیادہ دیر تک یہ منظر برداشت نہیں کرسکا۔ اور کمرے سے باہر نکل آیا۔

تقریباً ایک سال قبل تک ڈاکٹر صاحب نہ صرف کلینک پر بیٹھتے تھے۔ بلکہ اپنے رسالے ماہنامہ ”ہومیو ڈاکٹر“ کو خود مرتب کرتے۔ دوستوں کو خط لکھتے اخبارات کے علاوہ تمام ہفت روزے اور ادبی ماہنامے دیکھتے، اور پوتوں اور نواسوں کے لیے بھی وقت نکالتے۔ ریلوے بک اسٹال کے چودھری صاحب جو باقاعدگی سے انہیں ڈھیر سارے رسائل پہنچایا کرتے تھے، اکثر بتاتے کہ ڈاکٹر صاحب ”چٹان“ اور ”نئی زندگی پبلی کیشنز کے ہفت روزہ رسالے شوق سے پڑھتے ہیں۔ ایک بار عجب والہانہ انداز میں مجھ سے بولے، اب آپ بہت اچھا لکھنے لگے ہیں، اور پاس بلا کر بہت دیر دعائیہ کلمات سے نوازتے رہے۔ ان کے اس جملے سے مجھے احساس ہوا کہ وہ کتنے عرصے سے میری ڈائریاں پڑھ رہے ہیں۔ ”جسارت“ کے اداریوں

کو بھی گہری دلچسپی سے پڑھتے اور پھر ان پر اظہارِ خیال کرتے۔ مگر اتنی قربت کے باوجود میں آج خود کو تہی دامن پاتا ہوں کہ ان کی فسوں خیز زندگی کے واقعات کو جمع نہ کر سکا۔

ڈاکٹر صاحب قیامِ پاکستان سے پانچ سال قبل ہی حیدر آباد میں آ کر بس گئے تھے، یہ وہ دور تھا جب علامہ مشرقی سے ان کے اختلافات بھی پیدا ہوئے۔ مئی ۱۹۴۸ء میں جب ان کا بیٹا خالد اپنے ایک عیسائی دوست کو بچانے کی کوشش کرتے ہوئے پھلیلی نہر میں ڈوب گیا، تو ڈاکٹر صاحب قبل از وقت بوڑھے ہو گئے۔ انہوں نے خالد کی یاد میں خالد میموریل گرلز اور بوائز ہائی اسکول کی بنیاد رکھی، ابتداً یہ معمولی جھونپڑیوں میں پرائمری اسکول تھے۔ مگر چند سال بعد ہائی اسکول کے درجے تک پہنچے۔ نیم پختہ کمروں کی جگہ شاندار عمارت نے لے لی۔ اسکول کی عمارت ہی میں انہوں نے سندھ ہومیو پیتھک میڈیکل کالج کی بنیاد رکھی۔ جس کے پرنسپل اب ان کے بیٹے فاروق نامی ہیں۔ قومی ملکیت میں چلے جانے کے بعد اسکول کی عمارت ان کے لیے اجنبی ہو گئی تو ہومیو پیتھک کالج کی جگہ کے لیے کئی سال سرگرداں رہے۔ اس عرصے میں حکومت بھی تبدیل ہوئی۔ آخر کار ۱۹۷۹ء میں ہومیو پیتھک کالج گرو نگر ٹرسٹ بلڈنگ میں منتقل ہوا اور اس کی منتقلی کی تقریب ڈاکٹر نامی کی زندگی کی آخری عوامی تقریب ثابت ہوئی۔

جہاں بے شمار لوگ ڈاکٹر نامی کے مدّاح اور ان کی خوبیوں کے معترف ہیں وہیں کچھ ناقدین بھی تھے لیکن ان ناقدین کا قد کاٹھ کبھی بھی ڈاکٹر نامی کے سراپا کو نہ چھو سکا۔ ہمارے معاشرے کو یہ ایک عجب مرض لاحق ہے کہ کسی کی ستائش کرتے ہیں تو اسے فرشتوں کا ہمسر بنا کر چھوڑتے ہیں۔ خواہ وہ اس قابل نہ ہو، اور کسی کی مخالفت کرتے ہیں تو یہاں بھی تمام حدود پھلانگ جاتے ہیں۔ دونوں مقامات پر انسانی خوبیاں اور خامیاں ہاتھ نہ آئیں تو بے دریغ مذہب کا استعمال ہوتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے ناقدین کے پاس اس کے سوا کچھ اور نہ تھا کہ انہیں قادیانی بنا دیں۔ "آدمی تو اچھے ہیں مگر سُنا ہے قادیانی ہیں"۔ یہ جملہ میں نے بڑے بڑے بھلے مانسوں سے سُنا اور مرض کی شدت کا اندازہ کیا حالانکہ ڈاکٹر صاحب الحمد اللہ بہت سے ان مسلمانوں سے "اچھے" مسلمان تھے جو اپنے مسلمان ہونے کی محض تختی لگائے پھرتے ہیں۔ اور پھر ان کے قادیانی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل اس کے سوا کیا ہو سکتی تھی کہ وہ "سچے اور پکے" خاکسار تھے۔ ایک ایسی تحریک کے علمبردار جس کا نعرہ جہاد رہا ہے۔

ڈاکٹر نامی کی تحریکی زندگی کا آغاز ۱۹۱۸ء میں تحریکِ خلافت سے ہوا جس کے دوران وہ جیل

بھی گئے۔ ۱۹۲۴ء میں انہوں نے سینٹرل ہومیوپیتھک میڈیکل کالج لاہور سے ہومیوپیتھی کی ڈگری حاصل کرکے لاہور ہی میں پریکٹس کا آغاز کیا۔ ۱۹۳۳ء میں طبیہ کالج لاہور میں داخلہ لیا اور اسی سال ہندوستان میں ہومیوپیتھی کی پہلی تنظیم آل انڈیا ہومیوپیتھی میڈیکل ایسوسی ایشن کے پہلے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ میں پنجاب کی نمائندگی کی۔ ۱۹۳۶ء میں آگرہ کے اجلاس میں شریک ہوئے۔ اس سے قبل ۱۹۳۵ء میں اپنا رسالہ جاری کیا جو آج بھی باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۷ء میں خاکسار تحریک میں شامل ہوئے اور تحریک میں نفاذِ تحریک کے بعد دوسرے نمبر کا عہدہ ملا اور علامہ مشرقی کے جانشین قرار پائے، ۱۹۴۱ء میں انہیں آل انڈیا ہومیوپیتھک کے اجلاس منعقدہ ناگپور میں شرکت کا اعزاز اس طرح ملا کہ آرگنائزنگ سیکرٹری چنے گئے۔

۱۹۴۴ء میں سندھ آنے کے بعد یہاں سندھ ہومیوپیتھک میڈیکل یونین کی بنیاد رکھی۔ قیام پاکستان کے وقت مہاجر کیمپوں میں کام کیا اور مہاجرین کی آبادکاری میں مدد کی۔ ۱۹۵۷ء میں جب حکومت نے پہلا ہومیوپیتھک بورڈ تشکیل دیا تو ڈاکٹر نامی اس کے ممبر نامزد ہوئے اسی طرح ۱۹۶۵ء میں دوسرے بورڈ میں شامل کئے گئے۔ ۱۹۶۸ء میں بورڈ کے الیکشن میں حصہ لیا اور کامیاب ہوئے۔ مشرقی پاکستان کے سقوط کے بعد بورڈ کے بلامقابلہ صدر چنے گئے اور یہ اعزاز مرتے دم تک حاصل رہا۔

۱۹۷۵ء میں وہی طریقہ علاج کے بارے میں قائم کئے جانے والے کمیشن کے ممبر ہونے کے علاوہ اسی سال انہیں ہالینڈ میں منعقدہ بین الاقوامی ہومیوپیتھک کانگرس میں پاکستانی وفد کی قیادت کا اعزاز بھی ملا۔ ان سرگرمیوں اور مصروفیات کے باوجود ڈاکٹر نامی نے حیدرآباد کی سطح پر مختلف تنظیموں میں کام کیا۔ سندھ چیمبر آف کامرس اینڈ انڈسٹری کے قیام میں بھرپور حصہ لیا، اور کئی برس تک اس کے نائب صدر رہے۔ سندھ کوآپریٹو یونین کے بارہ سال تک صدر رہے۔ سماجی بہبود کونسل حیدرآباد کے بھی رکن رہے اور جب مغربی پاکستان سماجی بہبود کونسل قائم ہوئی تو اس کے رکن نامزد ہوئے انجمن ہلال احمر میں شامل رہے اور ہلال احمر اسپتال لطیف آباد کی گورننگ باڈی میں کام کیا۔ اپنی انہی سماجی خدمات کے صلہ میں گورنر مغربی پاکستان سے تعریفی سند حاصل کی۔

ڈاکٹر نامی نے کئی دوائیں ایجاد کیں جن میں "سنیکو" نے بے پناہ شہرت پائی۔ چونکہ سندھ میں سانپ کے کاٹنے کے واقعات بہت ہوتے تھے اور یہ دوا سانپ کے کاٹے ہوئے

مریض کے لیے حیاتِ نو کا پیغام بنی۔ لہٰذا جلد ہی ڈاکٹر نامی کو سندھ کے کونے کونے میں شہرت حاصل ہوئی۔ بلا مبالغہ ان کی اس دوا سے ہزاروں جانیں تلف ہونے سے بچ گئیں۔ چند سال قبل جب سندھ میں زبردست سیلاب آیا تو ان کے صاحبزادے ایک اعلیٰ مقامی افسر کے پاس گئے کہ سنیکو کا عطیہ دیں تاکہ وہ اسے سیلاب زدہ علاقوں میں تقسیم کرانے کا بندوبست کرا دیں مگر افسر انہیں خاطر ہی میں نہ لائے اور یوں ظاہر کیا جیسے یہ عطیہ دینے نہیں ملازمت لینے آئے ہیں۔ یہیں پر حیدرآباد کی ایک مشہور شخصیت موجود تھی جو بعد میں وزیر زراعت ہوئے آخر اُن سے برداشت نہ ہو سکا، اور انہوں نے افسر کو مخاطب کر کے کہا "سنیئے جناب سندھ میں اگر کوئی شخص ڈاکٹر نامی کو نہیں جانتا تو مجھے اس کے سندھی ہونے پر شبہ ہوتا ہے"، اور یہ کہہ کر ڈاکٹر نامی کے صاحبزادے کو باہر لے آئے کہ میں تمہارا عطیہ براہِ راست حکومت سندھ تک پہنچا دوں گا۔ حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر نامی نے ہومیوپیتھی کے ذریعے سندھ کے عوام کی بے پناہ خدمت کی ہے اور ان کی موت کے ساتھ ۳۸ سالہ طویل دور اختتام کو پہنچا ہے، مگر اس طرح کہ ان کے اوصافِ حمیدہ اور صلاحیتیں جدید علم کے اضافے کے ساتھ ان کے صاحبزادوں اور بے شمار شاگردوں میں منتقل ہو گئے ہیں۔

علامہ اقبال کے یومِ وصال کو اپنی دنیاوی زندگی کا روزِ آخر قرار دے کر جانے والے ڈاکٹر نامی کے جلوسِ جنازہ میں شہر کے مختلف طبقہ ہائے فکر کے چیدہ افراد نے شرکت کی اور پھر فاتحہ سوئم میں اس سے کہیں زیادہ کا اجتماع اس بات کی دلیل تھا کہ یہ ایک شخص کی موت نہیں ایک ادارے کی موت ہے"۔

ڈاکٹر صاحب کے انتقال کے تقریباً ایک سال اور ساڑھے تین ماہ بعد ہی ان کی رفیقۂ حیات ۱۴ اگست ۱۹۸۱ء کو اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ کیا عجب اتفاق ہے کہ دونوں میاں بیوی کو وصال کے لیے دو یادگار تاریخیں ملیں۔

ڈاکٹر صاحب کے انتقال پر ملک بھر کے ہومیوپیتھس کے تعزیتی خطوط کا تانتا بندھا رہا۔ بزرگ صحافی میاں محمد شفیع نے بھی خط لکھا اور فاروق نامی کو بتایا کہ کس طرح ڈاکٹر صاحب نے انہیں اپنے گھر میں رکھا اور پرورش کی تھی۔ ڈاکٹر نامی کے تین صاحبزادوں میں سے محترم فاروق نامی شادی شدہ ہیں اور ماشاءاللہ تین بیٹوں اور دو بیٹیوں کے باپ ہیں، جبکہ چار صاحبزادیوں میں سے تین کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ بڑی بیٹی کے شوہر ڈاکٹر رضا الحق قریشی جو بلدیہ کے

ہیلتھ آفیسر بھی رہے ہے ۱۳ جولائی ۱۹۸۰ کو انتقال کر گئے۔ ایک داماد چودھری ذوالفقار قالین بافی کا کام کرتے ہیں اور ۱۹۷۹ء میں بلدیہ کے کونسلر منتخب ہو چکے ہیں، جبکہ تیسرے داماد محمد احکام الدین ایک صنعتی ادارے میں مینجر ہیں۔

ڈاکٹر نامی کے دوسرے دو صاحبزادوں میں منصور اسماعیل نامی اور رحید راسماعیل نامی شامل ہیں اپنے بڑے بھائی کی طرح انہوں نے بھی ہومیو پیتھک میں ڈپلومہ کیا ہے۔

۱۹۴۰ء کے ڈاکٹر نامی

۱۹۴۰ء سے قبل عید کے موقع پر دہلی سے شائع ہونے والا عید کارڈ
جو خاکسارِ تحریک اور اُس میں ڈاکٹر نامی کے مقام و مرتبے کی کہانی سُنا رہا ہے
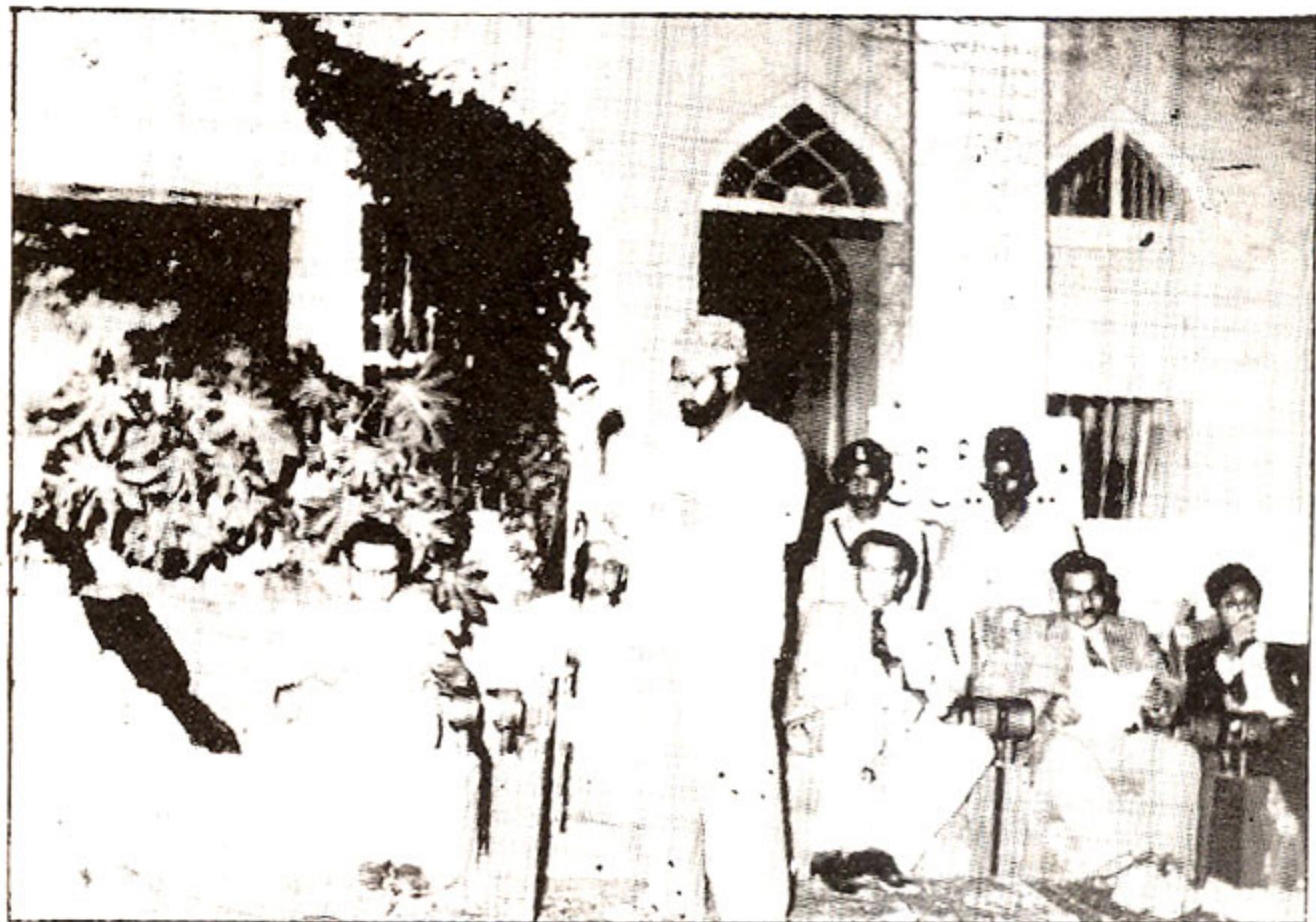
۱۹۵۵ء میں ہومیو پیتھک میڈیکل کالج کے افتتاح کے موقع پر
ڈاکٹر نامی کا سپاس نامہ ۔ قاضی اکبر وزیرِ تعلیم کی حیثیت سے شریک ہیں۔

۲۰۵ ویں یومِ ہانمن پر علامہ آئی آئی قاضی کی تقریر، کمشنر ابو نصر کی صدارت، ڈاکٹر نامی کا انہماک
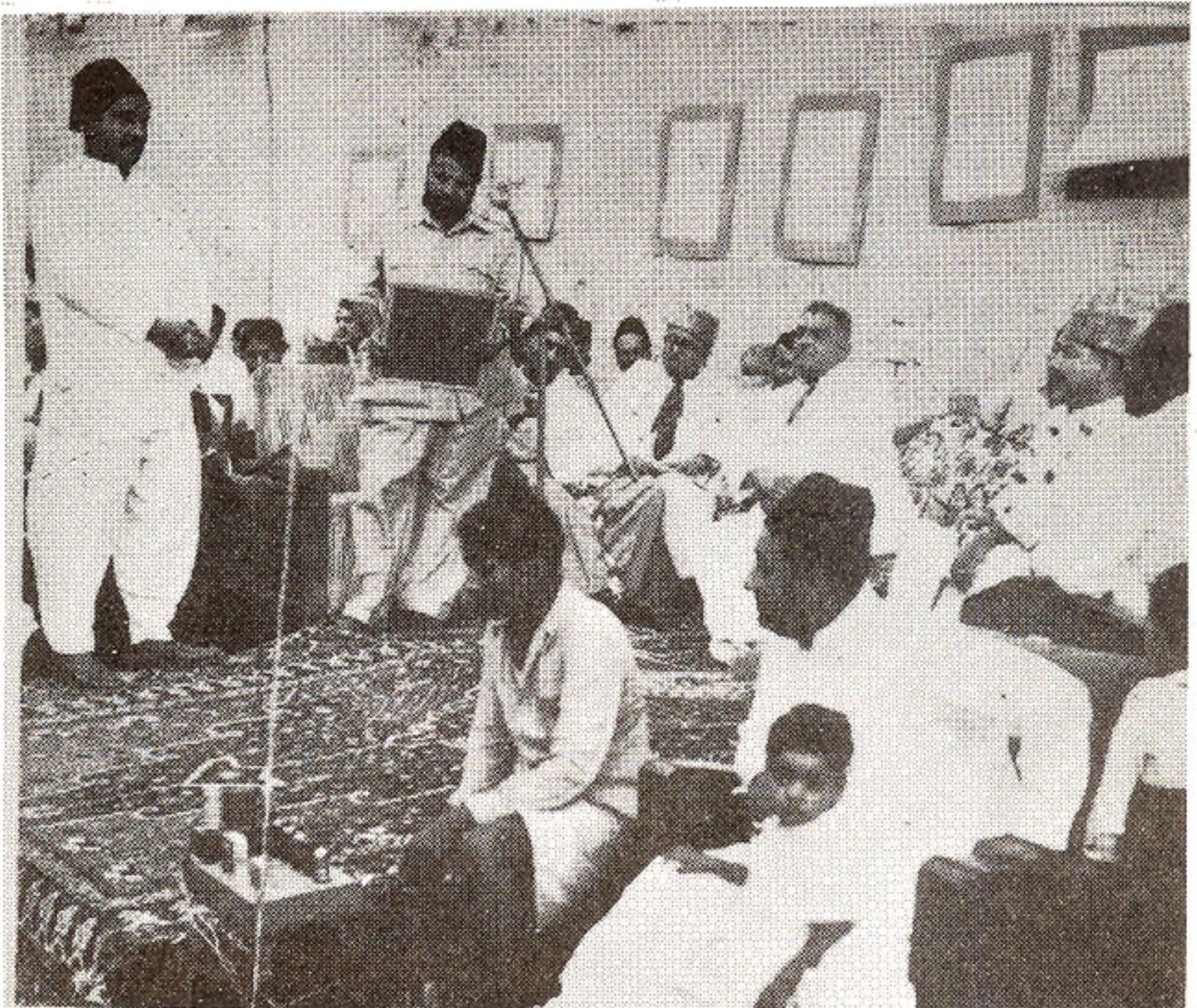
ایک تقریب میں ایوب کھوڑو وزیراعلیٰ سندھ کی حیثیت سے شریک ہیں۔ ڈاکٹر نامی
سپاس نامہ پیش کر رہے ہیں، حاجی محبوب الٰہی اور یوسف سرحدی (کھڑے ہوئے) دیکھے جاسکتے ہیں۔

ڈاکٹر نامی، ہاشم رضا اور ڈاکٹر یو اے پاشا

سابق مشرقی پاکستان کے ظہیر الدین لال میاں وزیر کی حیثیت سے ایک تقریب میں ڈاکٹر نامی
کی تقریر سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔ ڈاکٹر یو اے پاشا بھی تصویر میں نمایاں ہیں۔

ڈاکٹر نامی اپنی اولاد کی اولاد کے ساتھ

۱۹۴۱ء کے ڈاکٹر محمد اسمٰعیل نامی

۱۸۸۶ء جالندھر
۲۳ جنوری ۱۹۵۶ء حیدرآباد

خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز

انیسویں صدی کے آغاز میں جالندھر کے آرائیں گھرانے کا ایک نوجوان دِل میں خدمت انسانی کا عزم لیکر اپنے آبائی علاقے سے نکلا اور سینکڑوں میل دور دنیا کے عظیم ترین پہاڑ ماؤنٹ ایورسٹ کے دامن میں دارجلنگ کو اپنے اُس مشن کا مرکز بنایا جو ماؤنٹ ایورسٹ کی طرح ہی عظیم اور بلند تھا۔ تیس سال کی محنتِ شاقہ، عرق ریزی اور جوانی کے نچوڑ کے بعد اس نوجوان نے جو نقوش چھوڑے وہ آج بھی انمٹ ہیں اور کل بھی نشانِ راہ رہیں گے:

اِس نوجوان کا نام عبدالعزیز تھا۔ جو پہلے ڈاکٹر عبدالعزیز اور پھر خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز کہلایا۔ خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز کا نام شاید ۸۰ کی دہائی میں یہاں کے لوگ بھول چکے ہوں، بلکہ یقیناً بھول چکے ہیں۔ مگر انیسویں صدی کی دوسری اور تیسری دہائی سے پچاس کے عشرے تک برصغیر کے مسلم زعماء، متعدد ریاستوں کے راجوں، مہاراجوں اور نوابین کے لیے یہ نام صرف ایک گھرانے کے فرشتہ صفت بزرگ کا نام نہیں تھا۔ بلکہ خدمتِ انسانی کی بے لوث تاریخ کا عنوان بھی تھا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ۱۸۸۶ء کو جالندھر کے ایک متمول گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم یہیں حاصل کی اور لاہور سے ۲۱ سال کی عمر میں ویٹنری ڈاکٹر کا امتحان پاس کیا، انہیں ۱۹۰۷ء میں جبکہ پنجاب ویٹنری کالج کا پرنسپل ایک انگریز کیپٹن اسمتھ تھا، یونیورسٹی میں دوسری پوزیشن حاصل کرنے پر انعام ملا۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کو حصولِ تعلیم کے بعد پہلا تقرر نامہ دارجلنگ کا ملا۔ کوئی اور کم ہمت شخص ہوتا تو گھر سے سینکڑوں میل دور اس افتادہ مقام پر جانا پسند نہ کرتا۔ مگر ڈاکٹر عبدالعزیز کی جواں ہمتی کو داد دینی پڑتی ہے، کہ وہ نہ صرف ۱۹۰۸ء میں یہاں پہنچے بلکہ تیس سال بعد جب واپس ہوئے تو دارجلنگ اور خطۂ بنگال کی تاریخ کا حصہ بن چکے تھے۔

چین، سکم، بھوٹان، تبت، نیپال، آسام اور بھارت کے درمیان جغرافیائی حدود کو ملانے والے اس پُر فضا شہر " دارجلنگ " کی سرکاری زبان آج بھی نیپالی اور بھوٹانی ہے، مگر ڈاکٹر عبدالعزیز نے یہاں پہلی بار اُردو کو متعارف کرایا جو نصف صدی کے بعد خاصی پھل پھول چکی ہے۔

دارجلنگ پہنچنے کے کچھ ہی عرصے بعد ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو ڈاکٹر عبدالعزیز نے "انجمن اسلامیہ" کی بنیاد رکھی جس نے بنگال اور برّصغیر کے مسلم اور غیر مسلم زعمائے سے بے پناہ خراجِ تحسین وصول کیا۔ دارجلنگ کا دورہ کر کے خراجِ تحسین پیش کرنے والوں میں قائداعظم محمد علی جناحؒ سے لے کر سر سلطان محمد آغا خاں تک شامل ہیں۔

قائداعظمؒ نے جب ۲ جون ۱۹۱۷ء کو دارجلنگ کا دورہ کیا تو انجمن اسلامیہ کے مہمانوں کی کتاب پر اپنے تاثرات رقم کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعزیز کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔ انہوں نے لکھا کہ "اس چھوٹی سی جگہ پر مسلمانوں نے بڑے شہروں کے لیے تنظیم کی بہترین مثال قائم کی ہے"۔ قائداعظم نے اس بات پر مسرت آمیز حیرت کا اظہار کیا کہ گیسٹ ہاؤس اور اسکول دونوں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لیے یکساں طور پر کھلے ہوئے ہیں۔ قائداعظم نے مزید لکھا کہ "ڈاکٹر عبدالعزیز انجمن کے روحِ رواں اور مسلمانوں کے لیڈر ہیں"۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے دارجلنگ میں انجمن اسلامیہ کے تحت ایک بڑی اور ایک چھوٹی مسجد، چوبیس کمروں کا گیسٹ ہاؤس، طلبہ کے لیے ایک جونیئر مدرسہ اور طالبات کیلئے ایک مکتب قائم کیا۔ انہوں نے اپنی جیب سے مسلمانوں کے لیے قبرستان کی جگہ خریدی، کیونکہ اس سے پہلے وہاں مسلمانوں کا کوئی قبرستان نہیں تھا۔ جونیئر مدرسہ اور طالبات کے مکتب میں آج بھی قرآن پاک کی تعلیم لازمی ہے اور ہر طالب علم کو تیسری جماعت تک قرآن پاک ختم کرا دیا جاتا ہے۔ نصاب میں آدھے گھنٹے کے لیے مسجد میں نماز

کی عملی تربیت بھی شامل ہے ۔ انجمنِ اسلامیہ کا ایک بڑا کتب خانہ ہے جس میں نادر کتب کا ذخیرہ ہے ۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے لی پانگ میں محمدؐ بن تغلق کی تعمیر کردہ مسجد کو ۱۹۱۵ء میں دوبارہ تعمیر کرایا اور ۱۹۲۵ء میں سکمؔ کے دارالخلافہ گینڈگ میں بھی ایک مسجد تعمیر کرائی ۔ لی پانگ چین کی سرحد کے نزدیک ہے ۔ روایت ہے کہ محمدؐ بن تغلق نے اپنے دور میں چین کو فتح کرنے کے لیے ایک مہم روانہ کی تھی جو ناکام لوٹی تو مسلمان سپاہی واپسی میں لی پانگ اور تبتؔ میں بس گئے ۔ ان مسلمانوں نے لی پانگ میں جو مسجد بنوائی تھی وہ خستہ حال ہو چکی تھی جسے ڈاکٹر عبدالعزیز نے ازسرِ نو تعمیر کرایا ۔ اس مسجد کے متولیؔ کے بیٹے محمدؐ معظم ان دنوں ماؤنیٹرین کلب کے ایڈمنسٹریٹیو آفیسر ہیں ۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے جب سرکاری ملازمت کو فلاحی کاموں کی راہ میں رکاوٹ تصورؔ کیا تو ۱۹۱۱ء میں اسے خیرباد کہہ دیا اور پرائیویٹ پریکٹس کرنے کے ساتھ ساتھ تجارت اور اپنے آبائی پیشے زمینداری کو حصولِ روزگار کا ذریعہ بنایا ۔

۱۹۰۹ء سے ۱۹۳۹ء تک ڈاکٹر عبدالعزیز "نادرن بنگال ماؤنٹینڈ رائفل" میں گورنر بنگال کی خواہش پر اعزازی خدمت انجام دیتے رہے ۔ تقریباً ۳۰ برس تک ہی ڈاکٹر صاحب "انجمن انسدادِ بے رحمیِ حیوانات" کے رُکن رہے جس کا صدر بنگال کا گورنر ہوتا تھا ۔ اتنی ہی مدّت تک آپ آنریری مجسٹریٹ ، میونسپل کمشنر اور ممبر لوکل اینڈ ڈسٹرکٹ بورڈ رہے ۔ ڈاکٹر صاحب کو تیس سال تک صوبہ بنگال کے ہر گورنر کی مشاورتی کمیٹی کا ممبر ہونے کا اعزاز بھی حاصل رہے ۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کا جذبۂ خدمت اگرچہ کسی صلہ و ستائش کا محتاج نہ تھا مگر حکومتِ برطانیہ نے اس کا کھلے دل سے اعتراف کیا ۔ ۱۹۲۲ء میں انہیں "خان صاحب" کا اور ۱۹۲۸ء میں "خان بہادر" کا خطاب دیا گیا ۔ دارجلنگ کے باشندوں خصوصاً مسلمانوں کے لیے ان کی خدمات کا اعتراف نہ صرف سرکاری سطح پر ہوا بلکہ خطِ بنگال کی ہر شخصیتؔ نے سراہا ۔ اس کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ دارجلنگ میں صرف دو سڑکوں کے نام مسلم زعماؑ کے ناموں پر ہیں ، ان میں سے ایک خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز اور دوسرے بھارت کے صدر ذاکر حسین ۔

ڈاکٹر عبدالعزیز نے ۱۹۲۸ء میں سندھ کے ضلع تھرپارکر کے علاقے ڈگری میں نہ صرف اپنی جانب سے ایک ویٹنری اسپتال بناکر دیا بلکہ ایک سال تک مفت خدمات بھی انجام دیں۔ یہاں آنے کا پس منظر یہ ہے کہ حکومت نے اس علاقے کیلئے ایک ویٹنری اسپتال کی منظوری دی تھی، مگر شرط یہ تھی کہ یا تو علاقے کے لوگ خود اسپتال تعمیر کرائیں یا ڈاکٹر مہیا کریں۔ ٹنڈو جان محمدؐ میں ہندوؤں اور سکھوں کی اکثریت تھی جبکہ ڈگری میں مسلمان زیادہ تھے، غیر مسلموں کی خواہش تھی کہ اسپتال ٹنڈو جان محمدؐ میں بنے، مگر ان کے پاس ڈاکٹر نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کے ایک دوست حافظ علی محمدؐ مرحوم نے انہیں ساری صورتحال سے آگاہ کیا تو نہ صرف ڈاکٹر عبدالعزیز اتنا طویل فاصلہ طے کرکے یہاں پہنچے بلکہ اسپتال بھی اپنے خرچ سے بنوایا اور ایک سال تک خدمات بھی انجام دیں۔ یہ اسپتال ڈگری میں آج بھی موجود ہے۔

دارجلنگ میں ایک پُررونق جگہ کو "چورستہ" کہا جاتا ہے، یہاں انگریزوں کے کلب کے نزدیک ہندوؤں کا ایک مندر ہے۔ انگریز اس مندر کو ختم کرکے اپنے کلب کو توسیع دینا چاہتے تھے میونسپلٹی سے ہندو مقدمہ ہار گئے تھے، اس کے باوجود ڈاکٹر عبدالعزیز نے گورنر بنگال سے مل کر میونسپلٹی کے فیصلے کو رد کرایا۔ یہ مندر کلب کے نزدیک آج بھی قائم و دائم ہے۔ یہ پہلو بھی قابلِ ذکر ہے کہ انگریزوں کے اس کلب کے جس کا نام "سینی ٹیریم کلب" ہے، ڈاکٹر عبدالعزیز واحد مسلمان اور واحد انڈین ممبر تھے۔

انجمنِ اسلامیہ کی بنیاد ڈاکٹر عبدالعزیز نے ذاتی طور پر ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو رکھی اور ۲ فروری ۱۹۱۰ء کو اسے رجسٹرڈ کرایا۔ رجسٹرڈ دستاویز میں ڈاکٹر صاحب کا نام انجمن کے بانی کی حیثیت سے درج ہے۔ جب کہ پیٹرنز میں قائداعظم محمدؐ علی جناحؒ، سر سیّد شمس الہدیٰ اے کے ایس جمال آف رنگون، شیر بنگال اے کے فضل الحق، نوابزادہ سیّد الطاف علی چودھری آف بوگرا، خان بہادر مولوی مشرف حسین آف مرشد آباد، اے کے ابو احمد خان غزنوی، رائے ہری موہن چندرا بہادر اور آر این بینرجی بار ایٹ لاء جیسے افراد شامل ہیں۔ انجمن کا افتتاح گورنر بنگال لارڈ لٹن نے کیا۔ اس کے مقاصد میں جو باتیں شامل تھیں اُن میں قابلِ ذکر یہ ہیں:

دارجلنگ کے مسلمانوں میں تعلیم عام کرنا، ان کی معاشرتی، اخلاقی اور مذہبی اصلاح

کرنا، مسلمان یتیموں اور بیواؤں کی مدد کرنا، یتیموں کی تعلیم، رہائش اور خوراک کا مفت انتظام کرنا اور ان کی شادی بیاہ کا بندوبست کرنا اس کے علاوہ مستحق طلبہ کو وظائف دینا وغیرہ۔

انجمن کے گیسٹ ہاؤس میں ہر طبقے کے مسافر تین یوم تک قیام کر سکتے ہیں، جن کے قیام وطعام کی ذمہ داری کلیتاً انجمن پر ہوتی ہے، جبکہ مسلمان مبلغین متواتر سات یوم تک قیام وطعام کی سہولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس انجمن کے قیام اور فلاحی خدمات نے ڈاکٹر صاحب کو برِصغیر اور خطِ بنگال کی جن نامور شخصیات کی آنکھ کا تارا بنا دیا تھا اُن میں:

قائد اعظم محمد علی جناحؒ، شیرِ بنگال مولوی فضل الحق، خواجہ ناظم الدین، حسین شہید سہروردی، نواب بہادر سیّد نواب علی چودھری آف بوگرا، نواب سرشمسُ الہدیٰ، نواب سلیم اللہ خاں آف ڈھاکہ، نواب سر عالی امام، نواب مرشد آباد، نواب کے جی ایم فاروقی، مولوی تمیز الدین خاں، ڈاکٹر سر ضیاالدین، سر عبدالرحیم، خان بہادر ڈنشا آواری، مہاراجہ مونی لعل سنگھ راؤ، مہاراجہ بردوان، مہاراجہ سکم، سر سُریندر ناتھ، جون آرتھر، لارڈ کارمچل، رائے بہادر بی ایم چٹرجی وکیل، رائے بہادر ایس سینال وکیل، دھرنی دھر، رائے صاحب متھرا پرشاد، پارسی منی پردھان، سربی پی سنگھ، نواب بہادر خواجہ حبیب اللہ، خواجہ شہاب الدین، جسٹس محمد شریف، سر ظفر اللہ خاں، خواجہ غلام رُسول امرتسری اور مولوی فرزند احمد وغیرہ شامل ہیں۔

بنگال کے گورنروں میں لارڈ لٹن، سر جان اینڈرسن، جے اے ہربرٹ، اسٹینلے جیکسن وغیرہ سے بھی ان کے گہرے مراسم رہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کی شرافت، ملنساری، قناعت پسندی اور عاجزی کے ساتھ ساتھ خدمتِ انسانی کے گراں قدر جذبے نے ہر شخص کو متاثر کیا، خواہ وہ صاحبِ ثروت ہو یا غریب اور ضرورت مند۔

۲۶ اگست ۱۹۳۹ء کو انجمن اسلامیہ کے اجلاس میں ڈاکٹر عبدالعزیز کو تاحیات اعزازی صدر منتخب کیا گیا جبکہ ۱۹۴۲ء میں دارجلنگ کی ایک سڑک کا نام ان کے نام پر رکھنے کا سرکاری فیصلہ ہوا۔

۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو جب ڈاکٹر صاحب دارجلنگ سے جالندھر واپس آنے لگے تو اپنی ذمہ داریاں خان صاحب سیّد احمد حسین کے سُپرد کر آئے۔ یہ اُس وقت جونیئر

مدرسہ کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ ان دنوں چھپرہ (بہار) میں مقیم ہیں اور تقریباً سو سال کی عمر کے مالک ہیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کے اخلاص اور بے غرضی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ جب جالندھر واپس آنے لگے تو دارجلنگ میں موجود اپنی تمام جائداد اور اثاثوں کو انجمن اسلامیہ کے نام کر آئے، جن میں ایک شاندار مکان، چائے کے باغات، دوسری جائداد، حتیٰ کہ بنک بیلنس تک شامل ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا گھر اب ہوٹل میں تبدیل ہو چکا ہے اور چائے کے باغات اور دیگر جائداد کی طرح انجمن کی آمدنی کا بڑا ذریعہ ہے۔

ڈاکٹر عبدالعزیز ۲۰ سال قبل جس حالت میں دارجلنگ گئے تھے، اُسی طرح خالی ہاتھ لوٹ آئے، صرف ایک چیز تھی جو نام کا حصہ بن گئی تھی، اسے بھی جالندھر پہنچ کر تحریکِ پاکستان کی نذر کر دیا۔ انگریزی خطابات واپس کرنے کی مہم چل رہی تھی اور تحریکِ پاکستان شباب پر تھی۔ ڈاکٹر عبدالعزیز متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ۱۹۴۵ء میں قائداعظم جب جالندھر ریلوے اسٹیشن پر اُترے تو اپنے قائد کا استقبال کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالعزیز نے خان بہادری کا خطاب واپس کرنے کا اعلان کر دیا۔

پاکستان کے وجود میں آنے کے بعد ۱۹۴۷ء میں ڈاکٹر عبدالعزیز نے حیدرآباد سندھ کو اپنا مسکن بنایا۔ روزنامہ "جنگ" میں تقریباً بیس برس پہلے ممتاز صحافی اقبال جامد نے اپنے مضمون میں لکھا کہ وقت کے عظیم ترین اکابرین اور رہنما خود چل کر ڈاکٹر عبدالعزیز کی رہائش گاہ واقع ہیرآباد پر ملاقات کے لیے آتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کا تذکرہ "تاریخ آرائیاں" میں بھی ملتا ہے۔

خواجہ ناظم الدین کی ایما پر وزیر اعلیٰ سندھ پیر الٰہی بخش نے ان سے ملاقات کی اور ان کی خدمات کے تعلق سے مدد و معاونت کرنی چاہی تو اس مردِ درویش نے خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر کی عملی شرح پیش کر دی۔

۲۳ جنوری ۱۹۵۶ء کو ڈاکٹر عبدالعزیز حیدرآباد میں انتقال کر گئے اور ۱۲ مارچ ۱۹۷۸ء کو ان کی رفیقۂ حیات اس دُنیا سے رُخصت ہو گئیں۔

ڈاکٹر عبدالعزیز کے چھ بیٹے اور چار بیٹیاں ہیں۔ صاحبزادوں میں مُحمد اکرام الحق، احسان الحق، مظہر الحق، انصار الحق، انوار الحق اور آصف جہات اور صاحبزادیوں میں

مسنز اختر صادق حسین، رفعت رشید، مس فرحت اور مس راحت ہیں۔
خان صاحب سیّد احمد حسن اپنے تاثرات و مشاہدات بیان کرتے ہیں۔ ملاحظہ ہو:
عزیزی اکرام الحق چودھری اپنی اہلیہ نسرین بیگم کے ساتھ ۴۵ برس بعد ۲۵ جولائی ۱۹۸۳ء کو حیدرآباد سندھ (پاکستان) سے چند دنوں کے لیے دارجلنگ آئے اور شدید تقاضا کیا کہ میں ان کے والد گرامی ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کے کچھ حالات قلمبند کروں۔ یہ کام میرے لیے مشکل تھا۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب کے حالات لکھنے کے لیے ایک دفتر چاہیے جو میرے لیے بالکل ناممکن تھا۔ تاہم عزیزی اکرام الحق سلمہ کی فرمائش شدید ہوئی کہ خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب کے قیام دارجلنگ کے زمانہ کے کچھ حالات قلمبند کروں۔ خان بہادر مرحوم کے کارنامے اس قدر ہیں کہ جن کا لکھنا مجھ جیسے آدمی کا کام نہیں بلکہ مرحوم کے حالاتِ زندگی قلمبند کرنے کے لیے ایک ماہرِ قلم کی ضرورت تھی لیکن میں نے عزیزِ موصوف کی فرمائش پوری کرنے کی کوشش کی ہے۔
میں ۲۸ فروری ۱۹۲۵ء کو دارجلنگ آیا اور یکم مارچ ۱۹۲۵ء کو مدرسہ میں ایک مدرس کی صورت میں داخل ہوا۔ چونکہ کوئی ہیڈ ماسٹر نہیں تھا۔ لہٰذا مجھے ہیڈ ماسٹر کا عہدہ سپرد کیا گیا۔ میرے آنے کے ۱۹ دنوں کے بعد ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب مرحوم جلپائی گوڑی سے آئے اور مجھ سے ملاقات ہوئی چند دنوں کی ملاقات کے بعد مراسم بڑھتے رہے اور انجمن کے حالات ان کی زبانی اور دوسروں کی زبانی سنتا رہا جو مندرجہ ذیل ہیں۔
جناب ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب مرحوم شہر جالندھر پنجاب کے رہنے والے تھے۔ اپریل ۱۹۰۸ء میں وہ دارجلنگ مہاراجہ کوچ بہار کی ملازمت میں بصورت ویٹنری سرجن داخل ہوئے۔ اس وقت ایک چھوٹی مسجد تھی اور اس کے ملحق دو چھوٹے چھوٹے کمرے ایک امام مسجد کی رہائش اور دوسرا اگر کوئی مسافر آجائے تو اس کے قیام کے لیے تھا۔ اس وقت کے ماحول کے مطابق ڈاکٹر صاحب مرحوم کو خیال ہوا کہ مسلمان متفرق رہتے ہیں، ایک جگہ بیٹھ کر مسلمانوں کے فلاح و بہبودی کی طرف توجہ نہیں کرتے اس جوش اور ولولہ نے ڈاکٹر صاحب کو ایک کمیٹی قائم کرنے پر مجبور کیا۔ زندہ دلان پنجاب کا مقولہ تو مشہور ہی ہے لہٰذا ڈاکٹر صاحب مرحوم نے اپنے دستخط سے نوٹس جاری کیا اور مسلمانوں کا ایک جلسہ الحاج خواجہ عبدالصمد صاحب کی دکان واقع ایم پی روڈ پر ۵ دسمبر ۱۹۰۹ء کو طلب کیا خواجہ صاحب

موصوف امرتسر کے رہنے والے تھے اور پنجابیوں میں بہت معزز شمار کئے جاتے تھے۔ جلسہ منعقد ہوا جس کی صدارت جناب حاجی سیّد محمد مصطفےٰ صاحب نے کی، جو بھاگلپور کے رہنے والے تھے اور یہاں ڈسٹرکٹ انسپکٹر اسکول تھے۔ اس جلسہ میں بالاتفاق طے ہوا کہ ایک انجمن قائم کی جائے جس کا نام "انجمن اسلامیہ دارجلنگ" ہو۔ کمیٹی کا انتخاب ہوا۔ جس کے ۱۲ ممبر ہوئے۔ الحاج خواجہ عبدالصمد صاحب مرحوم صدر اور ڈاکٹر عبدالعزیز صاحب مرحوم سیکرٹری منتخب ہوئے۔ ۱۹۱۰ء میں انجمن کا مسافرخانہ جس میں ۲۴ کمرے تھے تیار ہوا۔ اسی سال مدرسہ لڑکوں کے لیے اور مکتب لڑکیوں کے لیے قائم ہوا۔ اُس کے چند سال بعد پرانی مسجد شہید کر کے موجودہ بڑی مسجد تیار ہوئی۔ ان کاموں میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کی ہمّت اور کوشش نے نمایاں کام انجام دیا۔ اب ان کی شہرت آسمان سے باتیں کر رہی تھی اور وہ مسلمانوں کے متفقہ لیڈر تھے۔ کچھ عرصہ بعد وہ آنریری مجسٹریٹ ہو گئے۔ مسلمانوں کی عزت اور سربلندی کے لیے انہوں نے جو کچھ کیا وہ ظاہر ہے اس کے علاوہ میونسپلٹی کا ایک سیاسی کام ایسا انجام دیا جس کی اہمیّت ہمیشہ برقرار رہے گی۔ دارجلنگ میونسپلٹی کے سارے کے سارے کمشنر فوج سے مقرر ہوا کرتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے میونسپلٹی میں انتخاب کرانے کی جنگ شروع کی جس میں رائے بہادر سینال وکیل اور رائے بہادر بی ایم چٹرجی وکیل نے ساتھ دیا۔ یہ جنگ ۱۹۱۴ء سے شروع ہوئی اتفاق سے اُس وقت گورنر کی ایگزیکٹو کمیٹی کے ممبر نواب شمس الہدیٰ بہادر تھے اور وہ ڈاکٹر مرحوم کی قومی و ملی خدمات کے بہت مداح تھے۔ ڈاکٹر صاحب مرحوم نے ان سے رابطہ کیا اور انہوں نے گورنمنٹ بنگال سے میونسپلٹی الیکشن کا قانون پاس کرایا۔ پہلا انتخاب ۱۹۱۶ء میں ہوا اور ڈاکٹر ۱۹۱۶ء سے جنوری ۱۹۳۷ء تک کمشنر رہے۔ فروری ۱۹۳۷ء میں انہوں نے کمشنری سے استعفےٰ دیا اور ان کی جگہ میں کمشنر ہوا۔

انجمن کی تقریباً ساری زمین ڈاکٹر صاحب مرحوم کی حاصل کی ہوئی ہے۔ اب وقت بعض پر کچھ عمارت انجمن اسلامیہ نے بنوائی ہے۔ جبکہ خاصی زمین اُفتادہ ہے جس پر عمارت بنانے کے لیے انجمن کوشاں ہے۔

جس سڑک کا نام کے بی ڈاکٹر عبدالعزیز روڈ ہے اُس روڈ پر انجمن گرلس مکتب کے نزدیک ہی ڈاکٹر صاحب مرحوم کی عدم موجودگی میں میونسپلٹی نے ایک عمارت ۱۹۲۶ء میں بھیک مانگنے

والوں کے رہائش کے لیے تعمیر کی اس وقت ڈاکٹر صاحب جالندھر میں تھے جب وہ دارجلنگ آئے تو میونسپلٹی سے لڑجھگڑ کر اس بلڈنگ کو انجمن کے لیے خریدا۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم سکم اسٹیٹ کی راج دھانی گینٹک کبھی نہیں گئے تھے۔ سکم کے راجہ سے گہری ملاقات تھی اس نے کئی دفعہ ڈاکٹر صاحب کو مدعو بھی کیا تھا۔ ۱۹۳۱ء کے نومبر میں گینٹک جانے کا ارادہ کیا گیا۔ دارجلنگ شہر کے ایک مشہور پارسی خان بہادر ڈی۔ الوری سے بڑی دوستی تھی۔ لہٰذا ڈاکٹر صاحب مرحوم خان بہادر آواری اور میں ——— دارجلنگ سے صبح روانہ ہو کر گیارہ بجے دن کو گینٹک پہنچے ڈاک بنگلہ میں قیام کیا اور کچھ آرام کرنے کے بعد شہر کا گشت لگایا۔ شہر خوبصورت ہے۔ چند مسلمان جو درزی کا کام کرتے تھے۔ ان کی چھوٹی چھوٹی دوکانیں تھیں لیکن تبت سے دارجلنگ آنے کا وہی راستہ تھا لہٰذا کچھ بھوٹانی اور تبتی مسلمان وہاں نظر آتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب ہم لوگوں کو راجہ سکم کے مکان پر لے گئے اور راجہ کو خبر دی انہوں نے چند منٹ میں ملاقات کے کمرے میں بلالیا۔ مہاراجہ نے ڈاکٹر صاحب سے شکایت کی کہ آپ ڈاک بنگلہ میں کیوں اترے یہاں کیوں نہیں آئے اس کے بعد ڈاکٹر صاحب اور خان بہادر آواری سے باتیں رہیں۔ مہاراجہ نے مجھ سے پوچھا کہ شہر کیسا ہے۔ میں نے شہر کے خوبصورتی کی تعریف کی اور کہا کہ مہاراجہ بہادر سب کچھ ہے لیکن مسلمانوں کے نماز پڑھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے۔ مہاراجہ نے اپنے ایک آفیسر کو ہم لوگوں کے ساتھ اس حکم کے ساتھ روانہ کیا کہ جو جگہ یہ لوگ پسند کریں دیکھ کر آؤ۔ ہم لوگوں نے بیچ بازار میں ایک میدان تھا اُس کو پسند کیا اور دوبارہ ہم لوگ مہاراجہ کے مکان پر گئے، ان کے ساتھ چائے پی اور مہاراجہ نے پسند کردہ زمین کا ایک نقشہ اور زمین کے بندوبست کا ایک کاغذ ہم لوگوں کے حوالے کیا اور ہم لوگ خوش خوش بازار میں واپس آئے۔ اتفاق سے ایک تبتی شفیع لا سے ملاقات ہوگئی کاغذات ان کے حوالے کیا اور ہم لوگ گیارہ بجے رات کو دارجلنگ واپس آگئے۔ یہ بھی ڈاکٹر صاحب مرحوم کا بڑا کارنامہ ہے۔ تین سال کے اندر گینٹگ میں شفیع لا نے ایک عمدہ مسجد تعمیر کرائی۔ افتتاح کے وقت مجھے طلب کیا تھا، مگر میں بیمار تھا افتتاحیہ جلسہ میں شریک نہیں ہوسکا۔

انجمن اسلامیہ دارجلنگ کے قیام کے بعد کالیمپونگ۔ کرسیانگ اور سلی گوڑی سب ڈویژن میں انجمنیں قائم ہوئیں جن میں ڈاکٹر صاحب مرحوم کا زیادہ ہاتھ تھا اور وہ برابر ان انجمنوں کی خدمت

کرتے رہے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم بنگالہ کے مشہور لوگوں میں سے ایک تھے سیاسی لوگوں سے بھی ان کے کافی مراسم اور گہرے تعلقات رہے۔

جناب ڈاکٹر صاحب مرحوم اپریل ۱۹۰۸ء میں دارجلنگ آئے اور ۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء کو اپنے وطن جالندھر کو روانہ ہوئے ان کی جدائی اہل دارجلنگ کے لیے ایک جانکاہ صدمہ تھا ڈاکٹر صاحب کا وجود دارجلنگ میں نہایت ضروری تھا لیکن ان کی خانگی مجبوریوں نے دارجلنگ چھوڑنے پر مجبور کر دیا اور دارجلنگ میں اندھیرا ہو گیا۔

اُوپر لکھ چکا ہوں کہ میں ۲۸ فروری ۱۹۲۵ء کو دارجلنگ آیا اور ڈاکٹر صاحب کا ساتھ ہوا اور ۵ اکتوبر ۱۹۳۹ء تک ساتھ رہا۔ ڈاکٹر صاحب کے سامنے ہی میں آنریری مجسٹریٹ اور میونسپل کمشنر ہو گیا تھا بلکہ یہ کہنا نہایت درجہ درست ہو گا کہ انہوں نے یہ سب کچھ دلوایا تھا۔ ان کے جانے کے بعد انجمن و مدارسِ انجمن کے کاموں کے علاوہ باہر کے کاموں کا بھی بوجھ سر پہ پڑا لیکن اللہ کے فضل سے مسلمانوں نے ساتھ دیا اس کے علاوہ وزرائے گورنمنٹ بنگالہ جو ڈاکٹر صاحب کے مداحوں میں سے تھے بالخصوص الحاج خواجہ سر ناظم الدین نے ہر کاموں میں اعانت کی۔ مسلمانوں نے مجھے انجمن کا پریذیڈنٹ بنایا، میں نے ڈاکٹر صاحب کے نام پر ایک سڑک کا نام کے پی ڈاکٹر عبدالعزیز روڈ میونسپلٹی سے پاس کرایا۔ یکم جنوری ۱۹۴۱ء کو گورنمنٹ نے مجھے "خان صاحب" کا خطاب دیا خداوند تعالےٰ نے اپنا فضل و کرم کیا اور میں ۲۷ اپریل ۱۹۶۱ء کو عازم حج ہوا اور واپسی پر چند سال انجمن اور مسلمانوں کی خدمت کی اور ۳۱ جولائی ۱۹۶۵ء کو تمام خدمات سے سبکدوشی حاصل کر کے مکان رہنے لگا۔ دعا ہے کہ خداوند تعالیٰ ڈاکٹر صاحب مرحوم کو اپنی جوارِ رحمت میں جگہ دے اور ان کے پسماندگان کے دین و دنیا کو سنوار دے۔ آمین یا رب العالمین!

خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز کا دورِ جوانی

20 June'17 Darjeeling

I was very pleased to see the Anjuman and its many sided activities. In a small place like Darjeeling the musalmans were shown method and organization which might set an example to more advanced cities. I was greatly struck with the spirit specially the cosmopolitan views of the people. The Musafar Khan and the school are open to every nonmoslem. The Girls school is a decided awaker to the right direction that the women of India should not be allowed to lag behind. I wish Anjuman every success. I can't mentioning the name of the energetic fact Mr. Aziz who seems to be the founder of the Anjuman.

sd/-

M. A. JINNAH

قائداعظمؒ کے تحریری خراجِ تحسین کا متن

---

23 June 17 Darjeeling

I was very pleased to see the Anjuman & its many sided activities. In a small place like Darjeeling the Musalmans have shown method & organization which might set an example to more advanced cities. I was greatly struck with the spirit specially the cosmopolitan views of the people. The Musafir khana & the schools are open to any non moslem. The Girls' School is a decided awakening to the right direction that the women of India should not be allowed to lag behind. I wish Anjuman every success. I cannot help mentioning the name of the energetic Secy. Mr Aziz who seems to be the soul of the Anjuman.

M.A. Jinnah

قائداعظمؒ کے تاثرات ان کی اپنی تحریر میں

I visited the Anjuman Islamia, Darjeeling, on the 14th November, 1945. I was greatly impressed by the moral and humanitarian work being done by a small community of about 1300 Muslims out of a total population of nearly 26,000 in the town.

The Anjuman has launched an ambitious scheme of building a four-storied house to provide first class accommodation to visitors of all communities. I had great pleasure in laying the foundation stone of this building. The local Muslims have contributed about Rs.75,000/- with an anticipated expenditure of Rs.3 lacs for this scheme.

The building will be of lasting benefit to the Anjuman and fulfil a long cherished want of the Muslim who visit Darjeeling which is so aptly called the queen of the hill stations. I commend it to the generous public to contribute freely to this building fund of the Anjuman

sd/-

(His Highness the Right Hon'ble
Sir Sultan Mohamed Shah Agha Khan
P.C., G.C. V.O., G.C.S.T., G.C.T.E.

Darjeeling
14-11-45

ہز ہائی نس آغا خان کے تاثرات

I paid a visit to the Anjuman-i-Islamia, Darjeeling, on the 2[illegible]th September 1930. I was shown round the Ajuman premises - the guest house, the mosque and the madrassah. The very good and the useful work that the Anjuman is doing struck me very much. I heard much about the Anjuman before but I had not the privilege of seeing it from close quarters. The guest House is a special feature of this Anjuman where gentlemen from all parts of Bengal who come to Darjeeling for a short visit, find ready and comfortable accommodation. The mosque is a fine specimen of the glory of Islam at this Hill station. The Boy's madrassah and the Girls school are also doing very useful work and I was specially pleased with the progress that has been made at the Girls school. It redounds to the credit of the handful of moslems of Darjeeling that with the true Islamic zeal, they are holding aloft the banner of Islam inspite of all their difficulties, financial and otherwise. I can only say that their example, their true devotion to the cause of Islam, are worthy of emulation by all the Mussalmans.

I wish the Anjuman all success in their very useful career.

Nawab of Dacca.
8.10.30.

نواب آف ڈھاکہ سر سلیم اللہ کے تاثرات

---

4. His Excellency Sir John Anderson—Governor of Bengal—

At the invitation of the President and Committee of the Darjeeling Anjuman Islamia, I visited the Anjuman on the 29th June, 1932. In the absence of the President I was received by the Hon'ble Nawab K. G. M. Faroqui and was taken round the buildings by the indefatigable Secretary Khan Bahadur Abdul Aziz.

It was a very great pleasure to me to meet the leading members of the Muslim Community of Darjeeling District and surroundings which testify so strongly for their practical devotion and charity. I was very favourably impressed by all that I saw—mosque, school and guest house alike. The Anjuman is manifestly rendering excellent service to the scattered musalman population of the district. Its labours are essentially practical and of direct moral and intellectual value to the community. I was especially glad to see the efforts that are being made—I believe successfully for the improvement of the education of both sexes. In the importance that they attach to education I am confident that the Anjuman are proceeding along sound lines.

I congratulate the Anjuman on the manner in which they are discharging their useful function and I wish them all success

Sd. JOHN ANDERSON,
Governor of Bengal.

۴۰- ۱۹۳۹ء کی سالانہ رپورٹ میں گورنر بنگال جان اینڈرسن کے تاثرات کا متن

I had the pleasure of receiving an address from the Darjeeling Anjuman Islamia in October 1922 and I was afterwards shown round their buildings, which include a mosque, guest house and school. I was very much pleased with what I saw and I have no doubt that the Anjuman is doing very good work.

Lytton

گورنر بنگال لارڈ لٹن کے تاثرات

Minutes of the Proceedings of a General Meeting of the Anjuman Islamia, Darjeeling, held on *Saturday, the 26th August, 1939,*

In view of the continuous, wholehearted and persevering sincerety evinced by Khan Bahadur Dr. Abdul Aziz, since laying its foundation on the 5th December 1909, towards the cause of the Anjuman, Darjeeling, and his efforts to raise the institution to its present standard of efficiency and high esteem during the long period of 30 years and in appreciation of his courage and tact in piloting the institution through hard times, this meeting do honour him by electing him Honorary Life President of the Anjuman Islamia, Darjeeling.

PHARINE VILLA,
DARJEELING.

The 21st May, 1935.

My dear Khan Bahadur,

I am here from the 22nd of the last month but will be away for a few days, that is from 5th June to 12th at Chakdighi. You are greatly missed here, specially by me. Pray try to come up as soon as possible for more than one very important matter which brooks no delay. I have some important matter before Hon'ble Choudhury Zafarulla ~~Khan, Member, Executive Council of the Government of India,~~ in charge of the Railway Department, who I knew to be not only in very intimate terms with you but a relation of yours. When may I expect you ? Kindly drop me a card and oblige. An early reply will greatly oblige, rather I would request you to come at once.

We are well. Hope this will find you and family in the best of health.

With best regards,
Yours affectionately,
Manilall Singh Roy

Khan Bahadur Dr. Abdul Aziz
Jalandar City,
(Punjab.)

مہاراجہ موتی لعل رائے سنگھ کے خط کا عکس

PRIME MINISTER OF EAST BENGAL,
CAMP KARACHI.

MAY 23, 1948.

My dear Prime Minister,

This is to introduce Khan Bahadur Dr. Abdul Aziz. He is a very old and dear friend of mine and did great work in Darjeeling for the Muslims. I have very high opinion of his services to the Muslim Community in Darjeeling.

I shall be glad if you kindly grant him an interview. He is going now to settle down in Sind and will be obliged for your keeping a friendly eye on him.

Yours sincerely,

sd/-

(KHWAJA NAZIMUDDIN)

The Honourable Pir Illahi Bakhsh
The Prime Minister of Sind,
Karachi.

خواجہ ناظم الدین کا خط وزیراعلیٰ پیر الٰہی بخش کے نام جس میں ڈاکٹر عبدالعزیز کو متعارف کرایا گیا ہے

No. 6484-GG/48.

GOVERNOR-GENERAL'S HOUSE
KARACHI

3rd October 48.

IMMEDIATE.

Dear Khan Bahadur,

I am directed to inform you that His Excellency the Governor-General will be pleased to see you at 10.0 a.m. tomorrow, Monday 4th October 48.

Will you please confirm the appointment.

Yours sincerely,
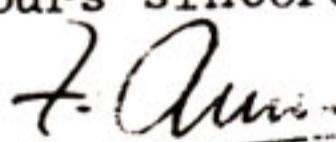
F. Amin

(F. Amin)
Asstt. Private Secretary.

Khan Bahadur Dr. Abdul Aziz,
C/o Ch. Sardar Mohammed,
Assistant Controller,
Railway Station,
Karachi.

خواجہ ناظم الدین نے گورنر جنرل کی حیثیت سے
ڈاکٹر عبدالعزیز سے ملاقات کی خواہش اس انداز میں کی

دارجلنگ میں انجمنِ اسلامیہ کے مکتب میں محمد اکرام الحق اور نسرین اکرام الحق کو دیے گئے استقبالیے کا ایک منظر

دارجلنگ میں انجمن اسلامیہ کے ریسٹ ہاؤس کے باہر محمد اکرام الحق
، بیگم اکرام الحق، خان صاحب سید احمد حسن اور دوسرے

جب محمد اکرام الحق اور ان کی بیگم نے گرلز مکتب کا دورہ کیا

خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز کی سب سے عظیم یادگار، دارجلنگ کی بڑی اور چھوٹی مساجد۔

دارجلنگ میں خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز روڈ پر خان صاحب سیّد احمد حسن،
محمد اکرام الحق اور بیگم اکرام الحق ——————— (۲۹ جولائی ۱۹۸۳ء)

دارجلنگ میں انجمن اسلامیہ کا مکتب، محمد اکرام الحق، بیگم اکرام الحق، سید احمد حسن اساتذہ اور طالب علموں کا گروپ

(جولائی ۱۹۸۳ء)

دارجلنگ میں ڈاکٹر عبدالعزیز کا وہ مکان جو اب ہوٹل میں تبدیل ہو چکا ہے اور انجمن اسلامیہ کے نام وقف ہے، جولائی ۸۳ء میں محمد اکرام الحق مکان کے دروازے پر کھڑے ہیں۔
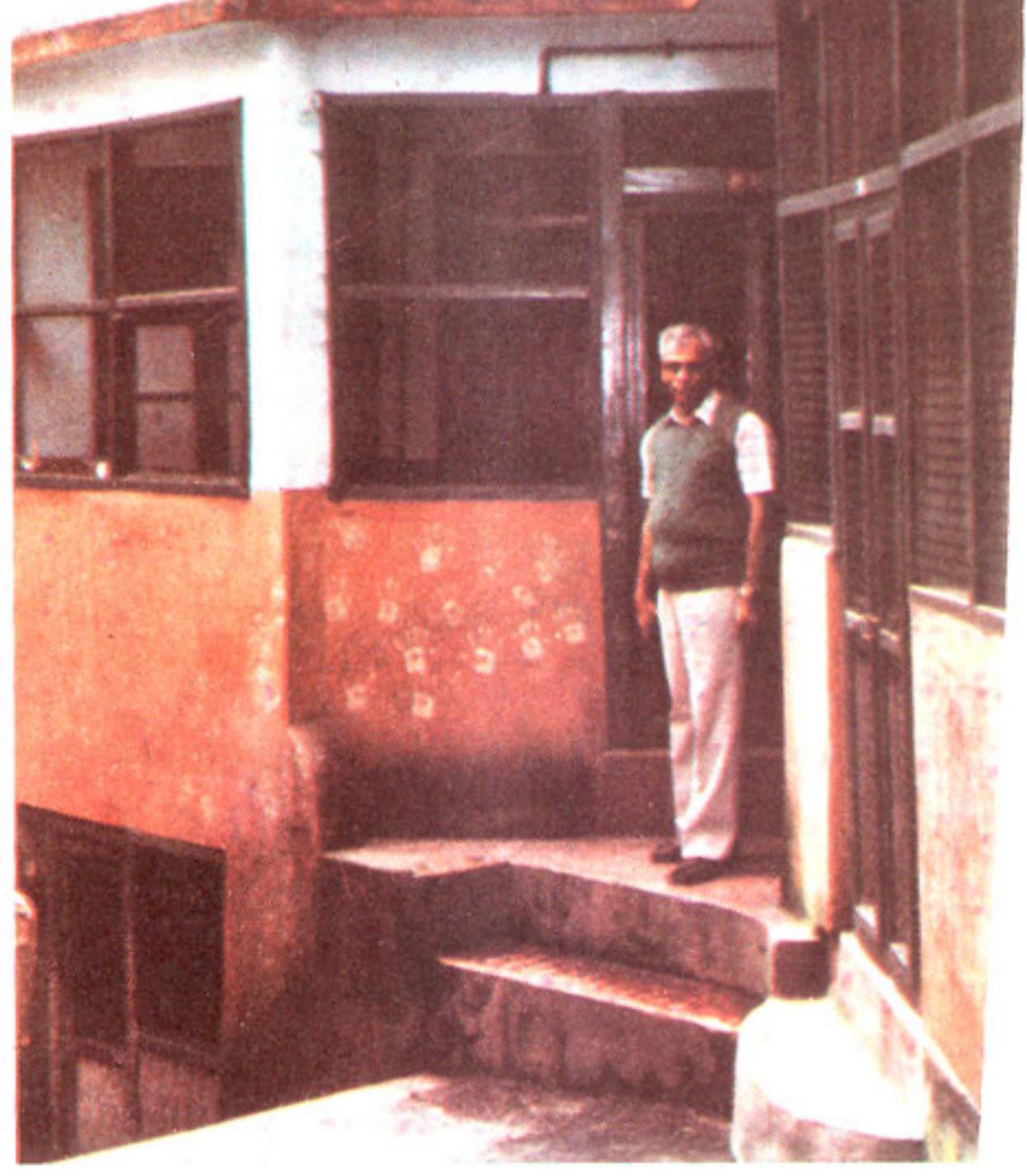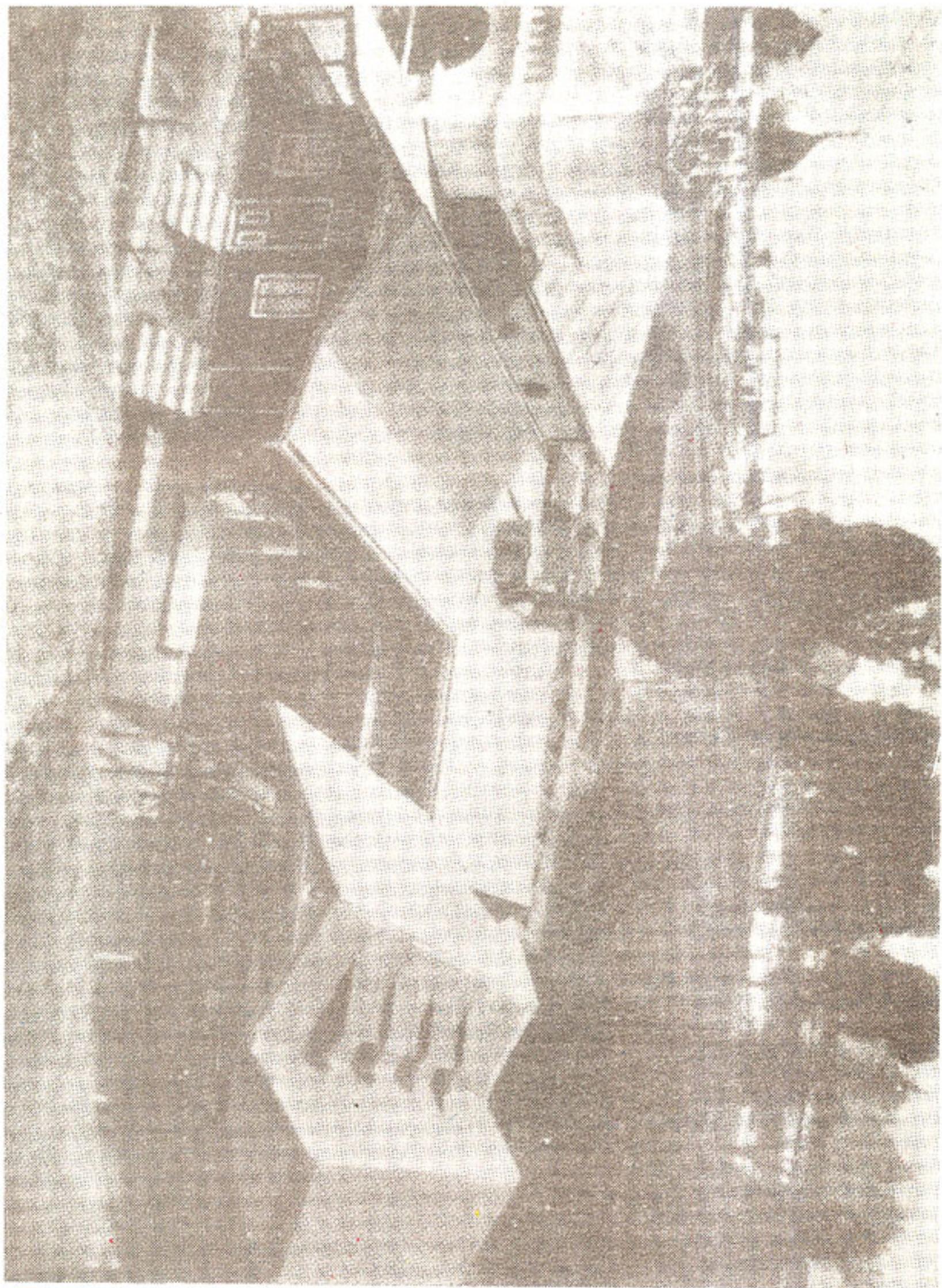
دارجلنگ میں انجمن اسلامیہ کا گیسٹ ہاؤس

گورنر بنگال کے ہمراہ ایک اور گروپ۔ ڈاکٹر عبدالعزیز کرسیوں پر پہلی صف میں دائیں سے دوسرے

گورنر بنگال کے ساتھ ایک گروپ فوٹو، شیر بنگال مولوی فضل الحق گورنر کے دائیں اور ڈاکٹر عبدالعزیز بائیں جانب ہیں جبکہ خواجہ ناظم الدین ڈاکٹر صاحب کے برابر انتہائی بائیں جانب!

خان بہادر ڈاکٹر عبدالعزیز (دائیں) خواجہ ناظم الدین اور خان صاحب سید احمد حسن (بائیں۔ داڑھی والے)

نواب بہادر نواب علی چودھری آف بوگرا (محمد علی بوگرا کے دادا) ان کے ساتھ دائیں نواب سید الطاف حسین چودھری آف بوگرا (محمد علی بوگرا کے والد) جبکہ ڈاکٹر عبدالعزیز پچھلی صف میں درمیان میں ہیں۔
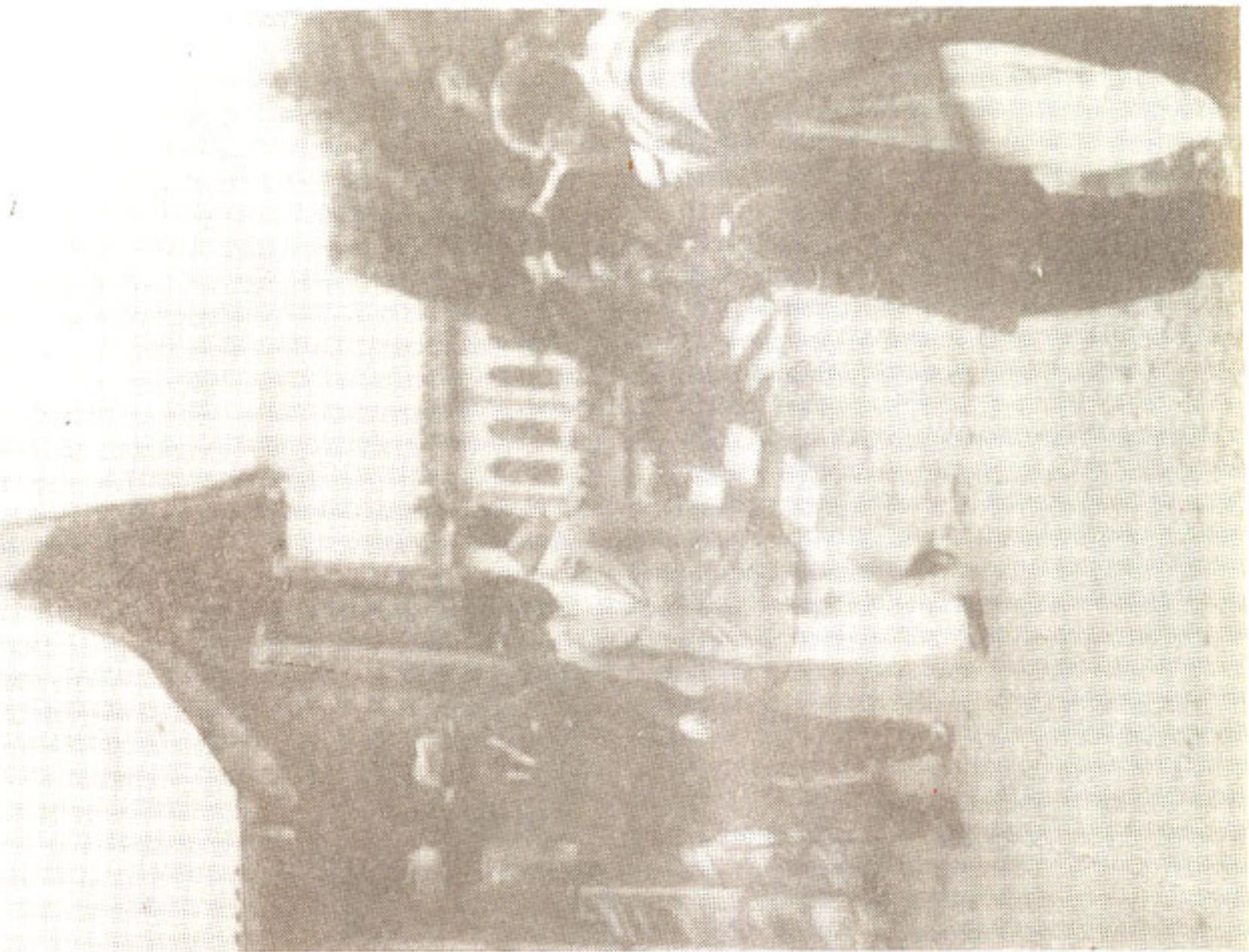
ڈاکٹر عبدالعزیز ، گورنر بنگال کے ہمراہ !

ڈاکٹر عبدالعزیز ۱۹۲۸ء میں گورنر بنگال جان اینڈرسن سے خان بہادر کا خطاب وصول کر رہے ہیں !

۱۹۱۴ء تمسّر سی پی

۱۸؍ اکتوبر ۱۹۷۷ء حیدرآباد

نامدار خان ایڈووکیٹ

وکیلِ نامدار، نامدار خان کے انتقال پر میں نے ۲۱ اکتوبر ۱۹۷۷ء کے "اسلامی جمہوریہ" میں یہ ڈائری سپردِ قلم کی تھی:

"ستّر سالہ نامدار خان ۷۷ء کے دسویں مہینے کی اٹھارہویں تاریخ کو صبح پونے آٹھ بجے اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے! وہ ایک بزرگ اور بلند پایہ قانون دان ہی نہ تھے، بلکہ ایک عظیم انسان اور پرانی قدروں کے رکھوالے کی حیثیت سے بھی یاد رکھیں جائیں گے۔ وہ نہ صرف حیدرآباد، بلکہ سندھ کے چند سینئر وکلاء میں سے ایک تھے۔

نامدار خان بھارت کے صوبہ سی پی کے ضلع جبل پور میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی مولانا احمد رضا خان بریلویؒ کی پوتی سے ہوئی، انہوں نے ایم اے فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا اور ایل ایل بی میں بھی فرسٹ ڈویژن حاصل کی۔ علی گڑھ سے علمی فراغت کے بعد انڈین سول سروس کے امتحان میں بیٹھے اور کامیاب ہوئے، مگر وکالت کو ترجیح دی۔ ۱۹۳۳ء میں پریکٹس کا آغاز کیا اور قیامِ پاکستان تک ناموری کی کیفیت یہ تھی کہ سندھ ہائیکورٹ کے علاوہ برِّصغیر کی تمام ہائی کورٹس میں بھی پیش ہو چکے تھے۔ ان کی ۴۴ سالہ پریکٹس نے عروج و زوال کے بہت سے مرحلے دیکھے۔ انہوں نے پاکستان میں آسودہ بائی قتل کیس اور محرّم فائرنگ کیس کی پیروی کی، اور تمام اعلیٰ عدالتوں میں متعدد بار پیش ہوئے۔

قیامِ پاکستان کی تحریک میں نواب صدیق علی خان کے شانہ بشانہ کام کیا اور اُن کے قانونی مشیر ہو گئے۔ برسوں تک بلدیہ حیدرآباد اور مختلف بنکوں کے

قانونی مشیر رہے۔ شہر کے مختلف سیاستدان اور صنعت کار ہمیشہ ان کے احسان مند رہے اور انہوں نے بھی ان کی پردہ پوشی کیے رکھی۔ بھارت میں قیام کے دوران نواب محی الدین خان آف ناگپور کے قانونی مشیر رہے اور حلقۂ احباب میں بھی شامل رہے۔

قیام پاکستان کے بعد اگرچہ اُنہوں نے کبھی عملی سیاست میں حصّہ نہ لیا، لیکن اپنے دل کو کبھی پاکستان کے درد سے غافل نہ رہنے دیا۔ مختلف ادبی نشستوں میں باقاعدگی سے شرکت کرتے رہے۔ کئی برس تک حیدر آباد لاء کالج میں پروفیسر رہے اور جناح لاء کالج کی گورننگ باڈی کے چیئرمین کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ سینکڑوں وکلاء ان کے شاگردوں میں گنے جا سکتے ہیں۔ کئی ایک نے اعلیٰ عدالتوں کے منصف کی حیثیت سے بلند منصب پایا۔

جامعہ سندھ کے شعبۂ اُردو کے سربراہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خان اور مرحوم صدر ایوب خان کے بھائی سردار بہادر خاں ان کے کلاس فیلو رہے۔ سردار بہادر خاں سے دوستی اتنی گہری تھی کہ پاکستان آئے، تو انہوں نے سرحد میں پریکٹس کرنے کا مشورہ دیا۔ جب سردار بہادر خاں وزیر بنے اور نامدار خاں ان سے ملنے کراچی گئے، تو سردار بہادر خاں نے پوچھ لیا، "نامدار خاں! کوئی کام تو نہیں"۔ اس پر نامدار خاں ناراض ہو کر چلے آئے اور پھر کبھی نہیں ملے۔ کہا کرتے تھے: "میں اپنے دوست سے ملنے گیا تھا، وزیر سے نہیں"۔

جب ہجرت کر کے پاکستان پہنچے، تو سچ مُچ کے مہاجر تھے۔ انہوں نے اپنی دنیا آپ بنائی اور نئے سرے سے زندگی کا سفر شروع کیا۔ ایک رات یہ نوبت آئی کہ جیب میں صرف ایک روپیہ تھا، نوکر کو دیا کہ میری طبیعت خراب ہے، تم باہر جا کر کھانا کھا لو! لیکن اس جانگسل رات کو بھی اطمینان سے سو گئے۔ صبح اُٹھے، تو ایک ایسا مؤکل فیس کے بقایا پانچ سو روپے لیے کھڑا تھا جس کے آنے کی کوئی اُمید نہ تھی۔

ہاکی کے بہت شوقین تھے۔ حیدر آباد لاء کالج میں پروفیسر ہوئے، تو پہلی بار ہاکی کی ٹیم ترتیب دی اور رانوار کھوکھر کی کپتانی میں دورے پر بھیجا، لیکن ۱۹۶۳ء میں رفیقۂ حیات کی جُدائی کے بعد تمام تفریحات کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ نہ شکار کا شوق رہا، نہ کھیلوں کا۔ اپنے اکلوتے بیٹے اور اکلوتی بیٹی کی تربیّت اور مشفقانہ پرورش کے بعد اگر کسی چیز سے دلچسپی تھی، تو وہ دفتر تھا۔

خان صاحب سے اگرچہ میرا تعلق بہت پرانا نہ تھا، لیکن میں جب بھی ملتا، تو اس محبّت سے پیش آتے کہ پاس بیٹھے رہنے کو جی چاہتا۔ "اسلامی جمہوریہ" منگا کر پڑھتے اور پھر رائے دیتے۔ کوئی مشکل درپیش ہوتی یا پیکٹ کی گمشدگی پر ریلوے یا پی آئی اے کو نوٹس دینے کا مسئلہ ہوتا، تو پیش پیش ہوتے۔ اگر زیادہ دن بغیر ملے گزر جاتے، تو بلواتے اور پھر گھنٹوں باتیں کرتے۔ ایک بار طبیعت خراب تھی، عیادت کو گیا، تو کہا: "آؤ آج کسی ہوٹل میں کافی پیئیں گے"۔ قاضی ساجد ساتھ تھے۔ ہم نے کہا: "ضرور بے شک چلئے طبیعت بہل جائے گی"۔ بیٹی نے باہر جانے کی بات سنی، تو پریشان ہوگئی فکرمندی اور انتہائی محبّت سے کہا: "ابّا جلدی آجائیے گا"۔ ہنستے ہوئے مجھے بتانے لگے "یہ بچپن سے مجھے بہت پیار کرتی ہے، ایک بار میرے بارے میں کوئی خواب دیکھا، تو صبح میرے قدموں سے لپٹ گئی کہ آپ آج دفتر نہ جائیں، میں نے پوچھا کیوں، تو بولی بس میں نے خواب دیکھا ہے، آپ باہر نہ جائیں، لہٰذا اُس روز میں کورٹ نہ جاسکا"۔

کرفیو کے دوران سوائے "قانون کے محافظوں" کے سب کو فراغت تھی، لہٰذا ہم اکثر خان صاحب کے پاس جا پہنچتے، کبھی کبھی میں اپنے آپ کو اس سلسلے میں اتنا بے بس محسوس کرتا کہ میرے سامنے علم اور تجربات کا دریا بہہ رہا ہے، میں اس میں ڈوب تو سکتا ہوں، لیکن اسے جذب نہیں کر سکتا۔ تحریکِ پاکستان کے واقعات اور زندگی برتنے کے سلیقے —— اور نجانے کہاں کہاں کے قصّے۔ دراصل نامدار خان اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔ ان کی وفات سے ایک ایسے باب کا اختتام ہوگیا جو کل اور آج کے درمیان رابطے کا نشان تھا۔ تہذیبی ورثے اور اس ورثے کے امانتداروں کے درمیان پُل تھا۔

جب نامدار خاں کا جنازہ اٹھایا گیا، تو جلوسِ جنازہ میں ہر حلقے کے لوگ تھے سیاستدان وکلاء، جج، ڈاکٹر، اساتذہ، شاعر، ادیب اور صنعت کار، سبھی لوگ موجود تھے"۔

نامدار خاں کی بیٹی فرزانہ نے اپنے عظیم باپ کے بارے میں چشمِ تر کے ساتھ جو کچھ لکھا اُس کا خلاصہ یہ ہے۔

نامدار خاں سی پی کے ضلع بھنڈارہ کے علاقے تمسر میں ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد سردار خان صاحب ٹھیکیداری کرتے تھے۔

نامدار خان نے ۱۹۲۸ء میں ناگپور سے میٹرک کیا، جغرافیہ کے مضمون میں بہت تیز تھے، لہٰذا اسکول کے انگریز ہیڈ ماسٹر نے فوج کے لیے نام تجویز کیا، مگر والد نے اس کی اجازت نہ دی۔ شاید ان کی نگاہوں میں تھا کہ اُن کا لائق بیٹا انگریز بہادر کا سپاہی نہیں تحریکِ آزادی کا سپاہی بنے گا۔

نامدار خان نے علی گڑھ سے میتھیمیٹکس میں بی اے آنرز کیا، پھر یہیں سے ایم اے اور ایل ایل بی کا امتحان پاس کیا۔ جامعہ سندھ کے شعبۂ اُردو کے سابق سربراہ ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں ان کے کلاس فیلو رہے۔ ۱۹۴۴ء میں مُحمّد علی خاں صاحب کی بیٹی حمیدہ بیگم عرف ذکیہ سلطانہ سے شادی ہوئی جو علی گڑھ کے مشہور بیرسٹر مُحمّد اسحاق خسرو کی ماموں زاد اور پھوپھی زاد بہن تھیں۔ مرحومہ کا سلسلہ نسب امام اہلِ سنت احمد رضا خاں بریلوی سے ملتا ہے۔ ذکیہ سلطانہ نے شیخ عبداللہ گرلز کالج علی گڑھ سے بی اے کیا تھا۔ ۱۹۶۱ء میں کینسر کے مرض کے سبب حیدر آباد میں ان کا انتقال ہوا۔

نامدار خان نے تحریکِ پاکستان میں سرگرم حصّہ لیا اور پاکستان بن جانے کے بعد ایک قلم اور پانی کی صراحی کے ساتھ ۱۹۴۸ء میں ہندوستان کو خیر باد کہا۔ حیدر آباد آنے کے بعد ابتدائی طور پر جناب نذیر احمد قریشی ایڈووکیٹ کے ساتھ وکالت کی۔ بعد میں اپنے منشی عبدالکریم مرحوم کے کہنے پر گاڑی کھاتہ میں علیحدہ دفتر قائم کیا۔ حیدر آباد بلکہ پورے سندھ میں جلد ہی وہ شہرت اور عزّت حاصل کی جو بہت کم دوسروں کے حصّے میں آئی ہوگی۔ کیپٹل سینما کی مالکہ ہندو بیوہ کے مقدّمے میں کامیاب پیروی کی۔ اس مقدّمے کی کارروائی آل انڈیا ریڈیو نشر کرتا تھا۔

نامدار خان کے بڑے بھائی عبدالمجید خاں تھے جن کے ایک بیٹے غلام فاروق اسٹیل ملز میں انجینئر ہیں۔ زیب النسأ بیگم مرحومہ بڑی بہن تھیں جن کی اولاد میں جناب ولایت احمد خاں سی ایس پی مقیم کراچی اور ڈاکٹر راحت احمد خاں مقیم انگلستان اور ثریا جبیں صاحبہ زوجہ جناب شاہ حسن اطہر ڈپٹی ڈائریکٹر پاپولیشن پلاننگ مقیم کراچی شامل ہیں۔

مہر النسأ بیگم، نامدار خان کی چھوٹی بہن ہیں جن کے دو بیٹے ڈاکٹر ریاض احمد خاں اور شکیل احمد خاں (طالب علم میڈیکل کالج) ہیں۔ اپنی چھوٹی بہن سے نامدار خان کو بےپناہ اُلفت تھی۔ مہر النسأ بیگم نے اپنے اس محبّت کرنے والے بھائی کے ساتھ ہی علی گڑھ

میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مہر النساء بیگم ناگپور میں انسپکٹر آف اسکولز تھیں۔ کراچی آنے کے بعد طویل عرصے تک جیکب لائن گرلز ہائی اسکول میں ہیڈ مسٹریس رہیں اور یہیں سے ریٹائر ہوئیں۔ تعلیم و تدریس کی دنیا میں مسز خان کے نام سے مشہور تھیں۔ ان کے شوہر شفیع اللہ خاں صاحب محکمہ سیٹلمنٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز رہے۔

نامدار خان اپنی بہن کو پیار سے "مہرن" کہتے تھے۔ اکثر ان کا ذکر کرتے اور زمانہ طالبعلمی اور تاج محل کی سیر و سیاحت کے قصّے سُناتے۔ ان کے لیے کہتے، یہ میری بہن ہی نہیں، دوست بھی ہے۔

نامدار خان ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۹ء میں شدید بیمار ہوئے لیکن اپنی مضبوط قوّتِ ارادی کے سبب بیماری کو ۱۹۷۷ء تک دبائے رہے۔ سرجن اشفاق حسین رضوی اور ڈاکٹر اوصاف حسین جعفری نے جو معالجین سے زیادہ ان کے دوست تھے، علاج معالجے اور تیمارداری کی ایسی مثالیں قائم کیں جن کا آج کے زمانے میں دُور دُور تک نشان نہیں ملتا۔

۱۸ / اکتوبر ۱۹۷۷ء کو شیر کا شکار کرنے والے نامدار خان کو بیماری نے پچھاڑ دیا۔ دل کا دورہ جان لیوا ثابت ہوا۔ قطعہ تاریخ وفات ڈاکٹر غلام مصطفےٰ خاں نے تحریر کیا۔

نامدار خان کی اکلوتی بیٹی کی شادی جناب عزیز الحسن سے ہوئی جو سینٹ پیٹرک کالج کراچی میں نفسیات کے لیکچرار ہیں، جبکہ اکلوتے بیٹے جناب اختر جمیل خاں کی شادی جناب عزیز الحسن کی بہن سے ہوئی۔ اختر جمیل خاں محکمہ انکم ٹیکس کراچی میں اسسٹنٹ کمشنر ہیں۔ جناب عزیز الحسن کا ایک بیٹا اور دو بیٹیاں اور جناب اختر جمیل کے ہاں بھی ایک بیٹا اور دو بیٹیاں ہیں۔

نامدار خان اپنے بیٹے اختر جمیل خان کی شادی کے موقع پر تصویر میں بدیع الحسن زیدی،
سرجن رضوی مرحوم، حسن احمد شاہ، امان اللہ خان اور قاضی ساجد صدیقی دیکھے جا سکتے ہیں

اپنے بیٹے اختر جمیل کی شادی کے موقع پر اُس وقت کے وزیر بدیع الحسن زیدی
کا خیر مقدم سرجن رضوی اور حسن احمد شاہ کے ہمراہ کر رہے ہیں۔

ہونہار باپ کا ہونہار بیٹا۔ نامدار خان اپنے اکلوتے بیٹے اختر جمیل خان کے ہمراہ
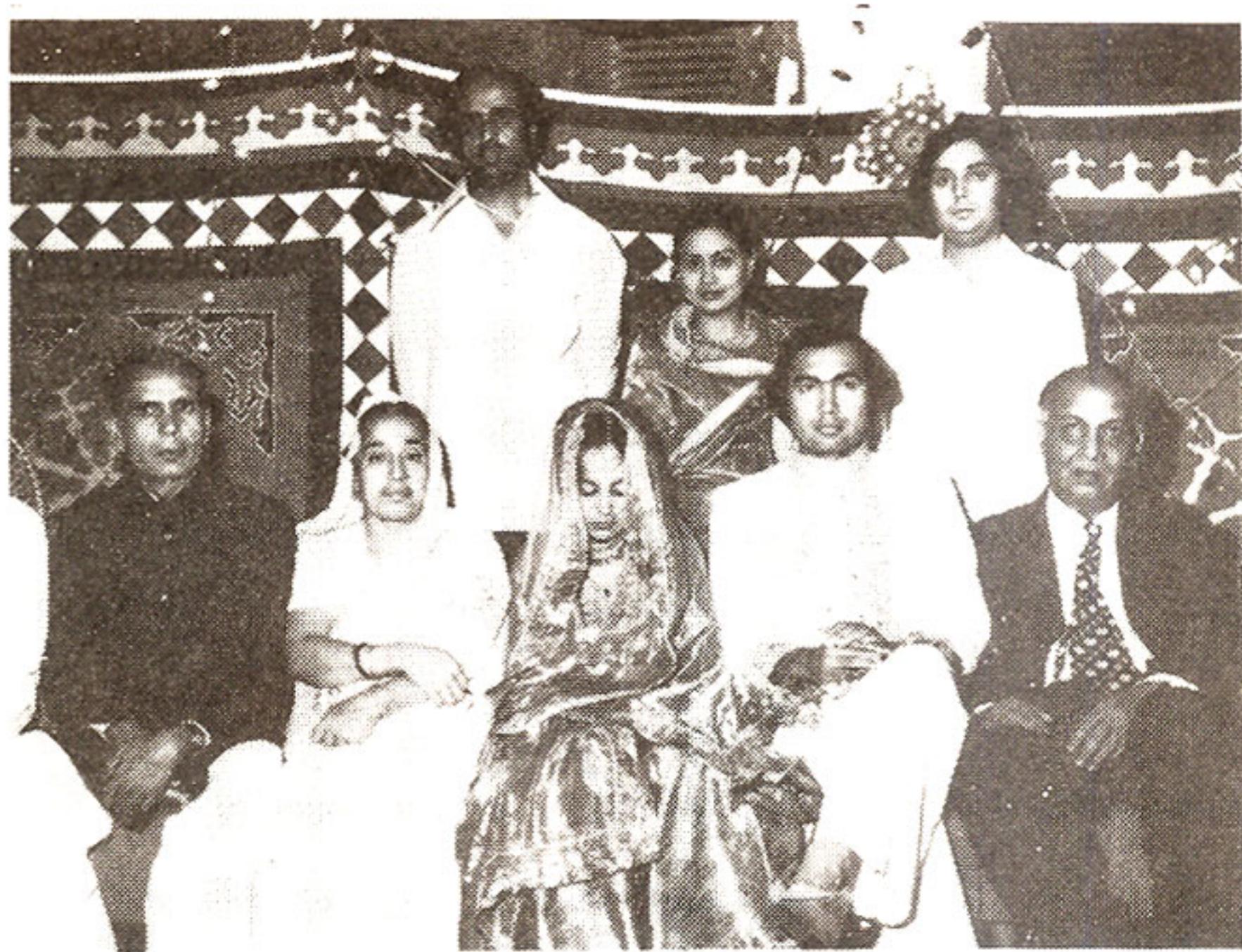
بیٹے کی شادی کے موقع پر نامدار خان تمام اہلِ خانہ کے ساتھ ۔
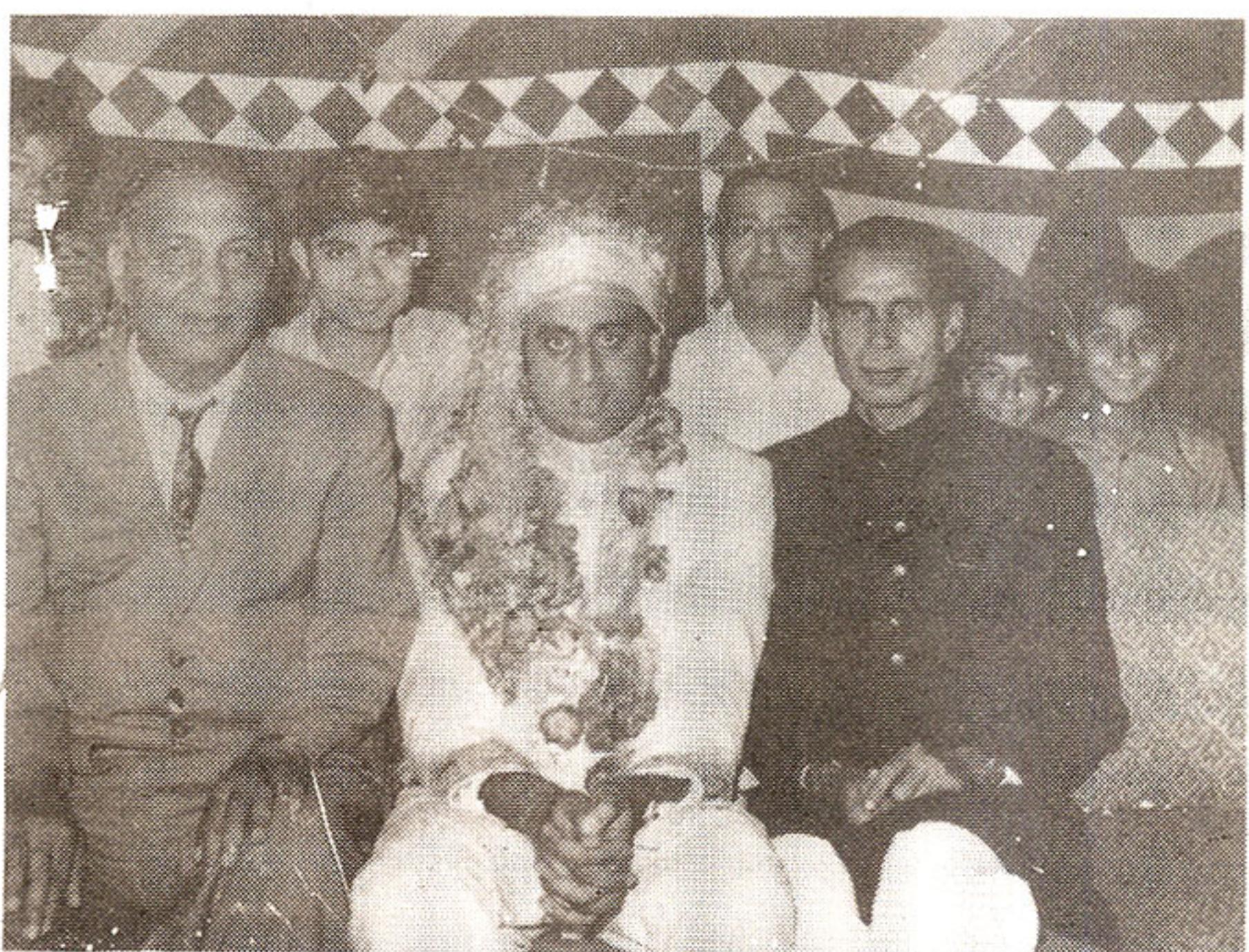
نامدار خان اپنے داماد عبدالعزیز اور دوسرے اہلِ خانہ کے ساتھ رسمِ نکاح کے بعد
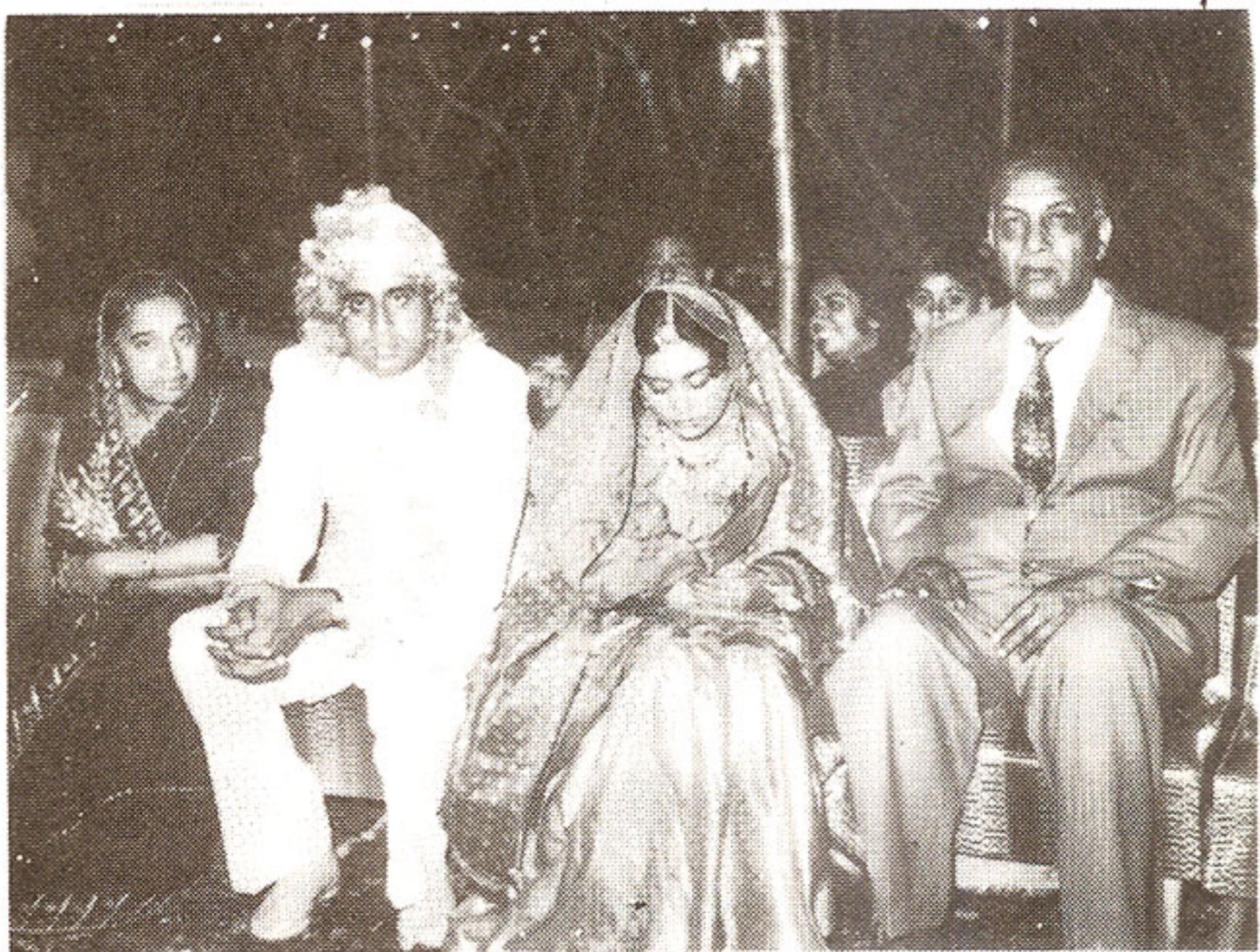
نامدار خان اپنی اکلوتی بیٹی فرزانہ کی شادی کے موقع پر بیٹی اور داماد کے ہمراہ

نامدار خان اپنے داماد عبدالعزیز کے ہمراہ
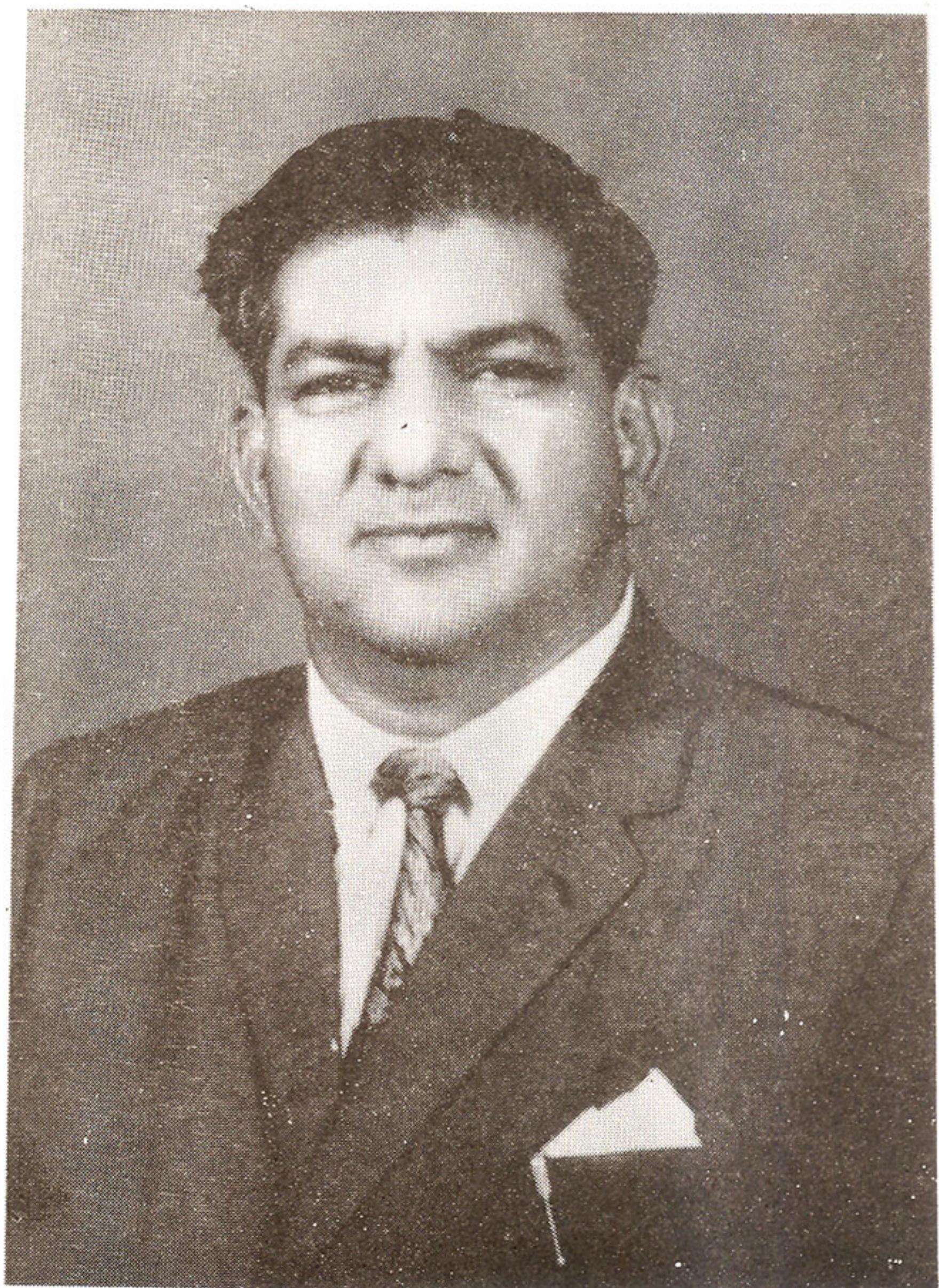
بالوترا ریاست جودھپور
۳۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کراچی

سیٹھ ولی بھائی اکبر جی

سیٹھ ولی بھائی کے لیے لکھنا آسان بھی ہے اور بے حد مشکل بھی۔ آسان اس لیے کہ سیٹھوں کے لیے تعریف و توصیف کے لیے چند الفاظ کو پھیلا دیا جائے تو خاکۂ زندگی بن جاتا ہے اور کام چل جاتا ہے، مگر مشکل اس لیے کہ سیٹھ ولی بھائی محض ایک سیٹھ یا ایک شخص نہیں' ایک ادارہ تھے۔

سیٹھ ولی بھائی کے انتقال پر میں نے ہفت "روزہ بادبان" میں جو ڈائری ۱۱ جنوری ۱۹۷۹ء کی اشاعت میں لکھی' پہلے اس پر نظر ڈالتے چلیں، میں نے لکھا تھا:

"دوسروں کی بیماریوں کے خلاف لڑنے والا اور ان کی زندگیوں کے لیے اپنی زندگی کھپا دینے والا انسان چل بسا کہ وہ اپنی بیماری کا مقابلہ نہ کر سکا، سیٹھ ولی بھائی اکبر جی نہ تو سیاست دان تھے اور نہ ہی مذہبی رہنما اور نہ انہیں دعویٰ تھا کہ وہ اس معاشرے کے ٹھیکیدار ہیں، نہ ہی اس شخص کو صلہ و ستائش کی تمنا تھی، مگر اس کے باوجود ولی بھائی کا جنازہ اٹھا تو سینکڑوں آنکھیں اشک بار تھیں اور ہزاروں بازو کندھا دینے کے لیے بیتاب۔

سیٹھ ولی بھائی ہمارے معاشرے میں موجود ہزاروں لاکھوں سیٹھوں کی طرح ایک عام سے سیٹھ تھے، عام سے آدمی تھے، لیکن ایک دن اب سے کئی سال قبل ان کی آدمیت نے انسانیت کا لباس زیب تن کرنا چاہا۔ اپنی تمام تر کم مائیگی اور بے بساطی کے باوجود مصمّم ارادے کے ساتھ میدانِ عمل میں آئے، تو بہت سی

رکاوٹیں تھیں، مزاحمتیں تھیں، تبصرے تھے، تمسخر تھا، تحیّر تھا اور اندیشے تھے لیکن راجپوتانہ اسپتال کی بنیاد پڑی تو تحیّر و تمسخر کی جگہ حیرت اور رشک نے لے لی اور مزاحم ہاتھ تعاون پر آمادہ ہو گئے، پھر ایک روز وہ آیا جب اسپتال نے کام شروع کر دیا تو معترضین بھی بے ساختہ کہہ اُٹھے "ارے ولی بھائی تو نرا سیٹھ نہیں کامل انسان ہے"۔ یہی وہ لمحہ تھا جب ولی بھائی کے تن پر لباسِ انسانیت جگمگا رہا تھا۔

راجپوتانہ اسپتال جو خالصتاً عوام کے پیسے اور عطیات سے تعمیر ہوا برِ اعظم ایشیا میں اپنی نوعیت کا واحد اسپتال ہے اور پاکستان میں اب تک تعمیر ہونے والے اسپتالوں میں سب سے بڑا۔ یہ اسپتال کُل ۵۳۲ بستروں پر مشتمل ہے جن میں چار سو عام مریضوں کے لیے ہیں اور ۱۳۲ پرائیویٹ کمروں پر مشتمل ہیں، پھر جدید ترین آلات، اعلیٰ اور تجربہ کار ڈاکٹر، خصوصی شُعبے اور سب سے بڑھ کر بے داغ اور خوبصُورت انتظام۔

اسپتال مکمل ہونے کے بعد جب صحافیوں کو دیکھنے کی دعوت دی گئی، تو ہم نے انھی کالموں میں لکھا تھا کہ اس اسپتال کے بنانے والوں نے اپنے لیے دنیا میں جنّت بنا لی ہے۔ جب تک اسپتال قائم رہے گا اور مریض شفایاب ہوتے رہیں گے، اسپتال کے معمار دعائیں پاتے رہیں گے۔

ولی بھائی کی خواہش تھی اسپتال کو مزید توسیع دی جائے۔ نرسنگ ہوسٹل تعمیر کیا جائے اور جدید علاج معالجے کی رہی سہی کسر پوری کر دی جائے۔ اسپتال کا سالانہ خرچ ۳۲ لاکھ سے زائد تھا اور اس خرچ کو پورا کرنے کے لیے ولی بھائی نے اس انداز سے پلاننگ کی تھی کہ کبھی دشواری پیش نہ آئے۔ انہوں نے تاحیات ڈونرز سکیم کے تحت اس مشکل کا حل دریافت کیا تھا۔

ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ سربراہ مملکت اسپتال کا باقاعدہ افتتاح کریں لیکن وہ اپنی ان تمام خواہشات کو دل میں سمیٹ کر لے گئے، یہ خواہشات ایسی نہ تھیں جن سے روح کو بے کلی ہوتی ہے ان کی سب سے بڑی خواہش اسپتال کی صورت میں پوری ہو چکی تھی۔ وہ دیگر تمام خواہشات کو اسپتال کے مقابلے میں کمتر سمجھتے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب خاندانی تنازعے کے سبب فتح ٹیکسٹائل ملز سے دست کش ہوئے، تو انہوں نے خود کو اسپتال میں محو کر لیا۔ ان کے قریبی ساتھی کہتے ہیں کہ یک جہتی اور بھائی چارگی

کے لحاظ سے سیٹھ اکبر جی کا خاندان دوسرے کاروباری خاندانوں کے مقابلے میں قابلِ رشک تھا، مگر چند ماہ قبل جب بٹوارہ ہوا، تو گویا سیٹھ ولی بھائی کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہوگیا۔ بہت کم لوگوں کو معلوم تھا کہ اب سیٹھ ولی بھائی کا فتح ملز سے واسطہ نہیں رہا۔ اس کا سبب شاید یہ بھی تھا کہ سیٹھ ولی نے خاموشی سے خود کو اسپتال کے سپرد کر دیا تھا

۲۰ دسمبر ۱۹۷۸ء کو موت سے قبل کراچی میں ان کے گردے کا آپریشن ہوا لیکن اپنی بیماریوں کے خلاف ان کی یہ آخری جنگ تھی، وہ اسی شب کو انتقال کر گئے۔ میت حیدر آباد لائی گئی اور ۲۱ دسمبر کو ان کا سفرِ آخرت تھا۔ وہ متعدد بیماریوں کا شکار تھے اور ان ہی کے علاج کے سلسلے میں چند روز بعد باہر جانے والے تھے، سیٹھ ولی کو جہاں پورے صوبے کے صنعتکاروں میں ممتاز مقام حاصل تھا، وہیں انہیں ایوانِ صنعت و تجارت حیدر آباد کے حلقے میں بادشاہ گر کی حیثیت حاصل تھی۔ خود ولی بھائی دوبار ایوان کے صدر ہوئے لیکن حقیقتاً ولی بھائی ہمیشہ صدر رہے کہ ایوان کا صدر عملاً ان کا نائب ہوتا تھا۔

ان مصروفیات کے علاوہ حیرت ناک امر یہ ہے کہ انہوں نے فتح ٹیکسٹائل کو گذشتہ چار سال میں جب کہ یہ دور ٹیکسٹائل کے لیے دیوالیے اور بحران کا دور تھا قابلِ رشک انداز میں چلایا۔ نہ صرف پیداوار میں کمی نہ ہونے دی، بلکہ مزدوروں کو چار چار بونس دیے۔

وہ صحیح معنوں میں مخیر شخص تھے۔ درجنوں مدرسوں، مساجد اور دیگر تعمیراتی کاموں میں دل کھول کر حصہ لیا۔ حیدر آباد اپنی جن چند چیزوں پر ناز کر سکتا ہے۔ ان میں عباس بھائی پارک، نیاز اسٹیڈیم، پبلک سکول اور عیدگاہ وغیرہ شامل ہیں۔ ولی بھائی نے سیٹھ عباس بھائی کے انتقال کے بعد اپنے بھائی کے نام سے منسوب اس خوبصورت میونسپل پارک کا تمام خرچ برداشت کیا۔ بہت کم لوگ آگاہ ہوں گے کہ پبلک سکول، نیاز سٹیڈیم اور عیدگاہ کی تعمیر میں ولی بھائی کا اہم حصہ ہے۔

سیٹھ ولی بھائی کے انتقال کے بعد یہ شہر شاید اب ان کا نعم البدل نہ پا سکے لیکن راجپوتانہ اسپتال نے انہیں امر بنا دیا ہے۔ یہ اسپتال جب تک دکھی انسانیت کی خدمت کرتا رہے گا اور بیماری کے خلاف جہاد کی علامت رہے گا، ہزاروں زندگیاں بے ساختہ اس کے معمار کو دعائیں دیتی رہیں گی۔ ہماری دعا ہے کہ خدائے بزرگ و برتر سیٹھ ولی کی اولاد کو اور خصوصاً ان کے بھتیجے سیٹھ عنایت کو ایسی ہی خوبیوں سے سرفراز کرے جو سیٹھ

ولی کی ذات میں مرکوز تھیں"۔

سیٹھ ولی بھائی اکبر جی بالوترا ریاست جودھپور میں پیدا ہوئے ——— ان کے والد کا نام اکبر جی تھا۔ آبائی پیشہ تجارت تھا اور تجارت ہی کے ذریعے ولی بھائی نے نام پیدا کیا۔

سیٹھ ولی نے دو شادیاں کیں۔ ان کی دونوں بیگمات ابھی بقید حیات ہیں۔

سیٹھ ولی کے بھائیوں میں سے اب صرف سیٹھ جان عالم حیات ہیں۔ سیٹھ برکت بھائی، سیٹھ اصغر بھائی اور سیٹھ عباس بھائی انتقال کر گئے۔ سیٹھ برکت کے نام پر فتح ٹیکسٹائل ملز کے سامنے پہاڑی پر خوبصورت ہل پارک بنایا گیا ہے جبکہ سیٹھ عباس بھائی کے نام پر مشہور و معروف عباس بھائی پارک، رانی باغ کے ساتھ ہے۔

سیٹھ ولی کے سات بیٹوں میں سیٹھ ہدایت اللہ سب سے بڑے ہیں۔ جو کئی سال ایوان صنعت و تجارت کے صدر رہے ہیں۔ دیگر صاحبزادوں میں محمدؐ فاروق، محمدؐ فرید، محمدؐ اکرم محمدؐ رفیق، محمدؐ اعظم اور محمدؐ شاہجہاں شامل ہیں۔ سیٹھ ولی کی بیٹیوں کی تعداد بھی سات ہی ہے۔ سیٹھ برکت بھائی جن کا انتقال ۱۹۶۶ء میں ہوا، کے دو بیٹے ہیں، عنائیت سیٹھ اور ایوب سیٹھ جبکہ سیٹھ عباس بھائی جن کا انتقال ۱۹۶۵ء میں ہوا، کے پانچ بیٹے ہیں، روشن سیٹھ، حبیب سیٹھ، شریف سیٹھ، وحید سیٹھ اور اشفاق سیٹھ۔

سیٹھ ولی تجارتی ضرورت کے لائق ہندی اور اُردو پڑھے ہوئے تھے لیکن بعد میں انہوں نے قرآن شریف ترجمہ کے ساتھ پڑھا اور انگریزی سے بھی واقفیت حاصل کی۔ مفتی محمود الوری ان کے پیر تھے۔

سیٹھ ولی کو ایوب خاں سے ضیا الحق تک پاکستان کے ہر حکمران سے ملاقاتوں کے مواقع ملے۔ ان کی بصیرت اور دور اندیشی کو وہی لوگ محسوس کر سکتے تھے جو اُن کے ہمراہ رہتے تھے۔ ایک بار صدر ضیا الحق سے مل کر نکلے تو اپنے ساتھی کی بات سے اتفاق نہ کیا کہ صدر ضیاء نوے دن میں انتخابات کرادیں گے۔ ولی سیٹھ نے کہا دیکھنا یہ شخص اپنے دورِ حکمرانی میں ایوب خان کو پیچھے چھوڑ جائے گا۔ پہلے بلدیاتی طرز کا ایک نظام رائج کرے گا اس کے چند سال بعد اپنا پروگرام واضح کرے گا۔ اور واقعی یہ سب کچھ درست ثابت ہوا۔

سیٹھ ولی نے بھٹو کے دور میں اپنی ذات کے بارے میں تحقیق کر کے یہ ثابت

کیا تھا کہ وہ دراصل سومرو ہیں اور ان کا تعلق سندھ کی سومرو قوم سے ہے۔ ٹھٹھہ کے مشہور سندھی شاعر ابراہیم منشی نے اپنی قوم کے سردار سیٹھ ولی بھائی سومرو کے لیے کتابچے بھی لکھے۔ نہیں معلوم کہ یہ سب کچھ سنجیدگی کے ساتھ تھا یا وقت کی رَو کے زیرِ اثر تھا جیسا کہ ۱۹۷۰ء کی انتخابی مہم کے وقت پنجاب میں ذوالفقار علی بھٹو نے خود کو آرائیں ثابت کیا تھا۔

سیٹھ ولی بھائی کے بھتیجے عنایت سیٹھ بالکل اپنے چچا کی خوبیوں کا مُرقع ہیں بلکہ جدید تعلیم کے طفیل ان سے بھی کہیں آگے ہیں۔ سیٹھ عنایت نے اس شہر کو بنانے سنوارنے میں اپنے خاندان کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ برکت بھائی پارک کے بعد لطیف آباد فائر بریگیڈ اسٹیشن کے نزدیک عظیم الشّان "ماں جی" اسپتال کی تعمیر کا آغاز ہو چکا ہے۔ یہ اسپتال عنایت سیٹھ کی دادی اماں کے نام پر ہے جو پورے خاندان میں ماں جی کہہ کر پُکاری جاتی تھیں۔ اسی شاہراہ پر برکت بھائی ٹاؤن پہلے ہی تعمیر ہو چکا ہے۔

راجپوتانہ اسپتال کا سنگِ بنیاد نصب کرنے کے موقع پر دُعا مانگی جارہی ہے، سیٹھ ولی۔
ہمراہ مفتی محمود الوری، غازی صلاح الدین مرحوم اور غازی عبد الکریم نمایاں ہیں

ایک یادگار تصویر۔ ایس ایس جعفری اور مسرور حسن خان کے ہمراہ درمیان میں برکت سیٹھ ہیں۔ سیٹھ ولی بھا
انتہائی بائیں جانب اور عنایت سیٹھ انتہائی دائیں جانب۔ روشن سیٹھ بھی نمایاں ہیں

کے ہمراہ عباس سیٹھ اور برکت سیٹھ کی یادگار تصویر — اختر حسین مرحوم گورنر مغربی پاکستان کی حیثیت سے ساتھ ہیں۔

راجپوتانہ اسپتال کی رسمِ افتتاحِ تعمیر جناب نصرت حسن کے ہاتھوں ۵ جنوری ۱۹۷۰ء کو انجام پائی۔
تصویر میں نصرت حسن اور سیٹھ ولی بھائی کے علاوہ عثمانی آرکیٹیکٹ، حافظ نصیر الدین، غازی
عبدالکریم، ڈپٹی حسن علی اور پشت پر مقصود احمد نمایاں ہیں۔

سیٹھ ولی بھائی اور گورنر مغربی پاکستان جنرل موسیٰ، عباس بھائی پارک کی بارہ دری میں۔ کمشنر مسرور حسن خان اور محبوب خان غوری نمایاں ہیں

سیٹھ ولی بھائی اور جنرل رحمان گل، گورنر سندھ کی حیثیت سے ۔ سیٹھ عنایت سپاس نامہ پیش کر رہے ہیں۔

ذوالفقار علی بھٹو وزیرِ اعظم کی حیثیت سے راجپوتانہ اسپتال
میں سیٹھ ولی بھائی کے ساتھ محبوب خان غوری بھی ہیں۔

سیٹھ ولی بھائی کی پیر پگاڑو اور ان کے ساتھی ذوالفقار جاموٹ کے ساتھ ایک یادگار تصویر

سیٹھ ولی بھائی اور غلام مصطفےٰ جتوئی ـــ وزیراعلےٰ سندھ کی حیثیت سے خیر مقدم
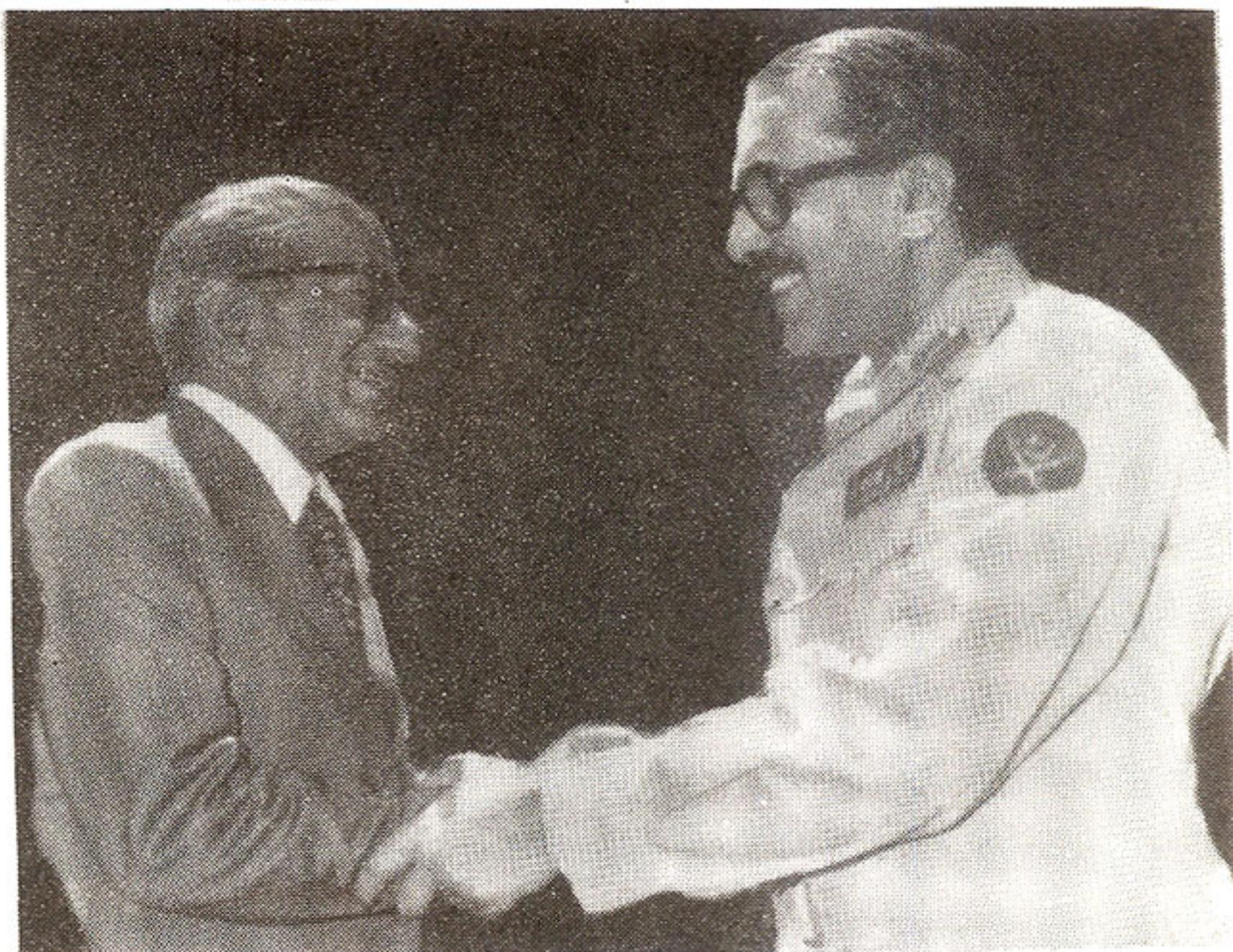
سیٹھ ولی بھائی صدر ضیاء الحق سے مصافحہ کرتے ہوئے

ولی سیٹھ اور گورنر سندھ ایس ایم عباسی، عقب میں بریگیڈیئر مسعود الحسن ہیں
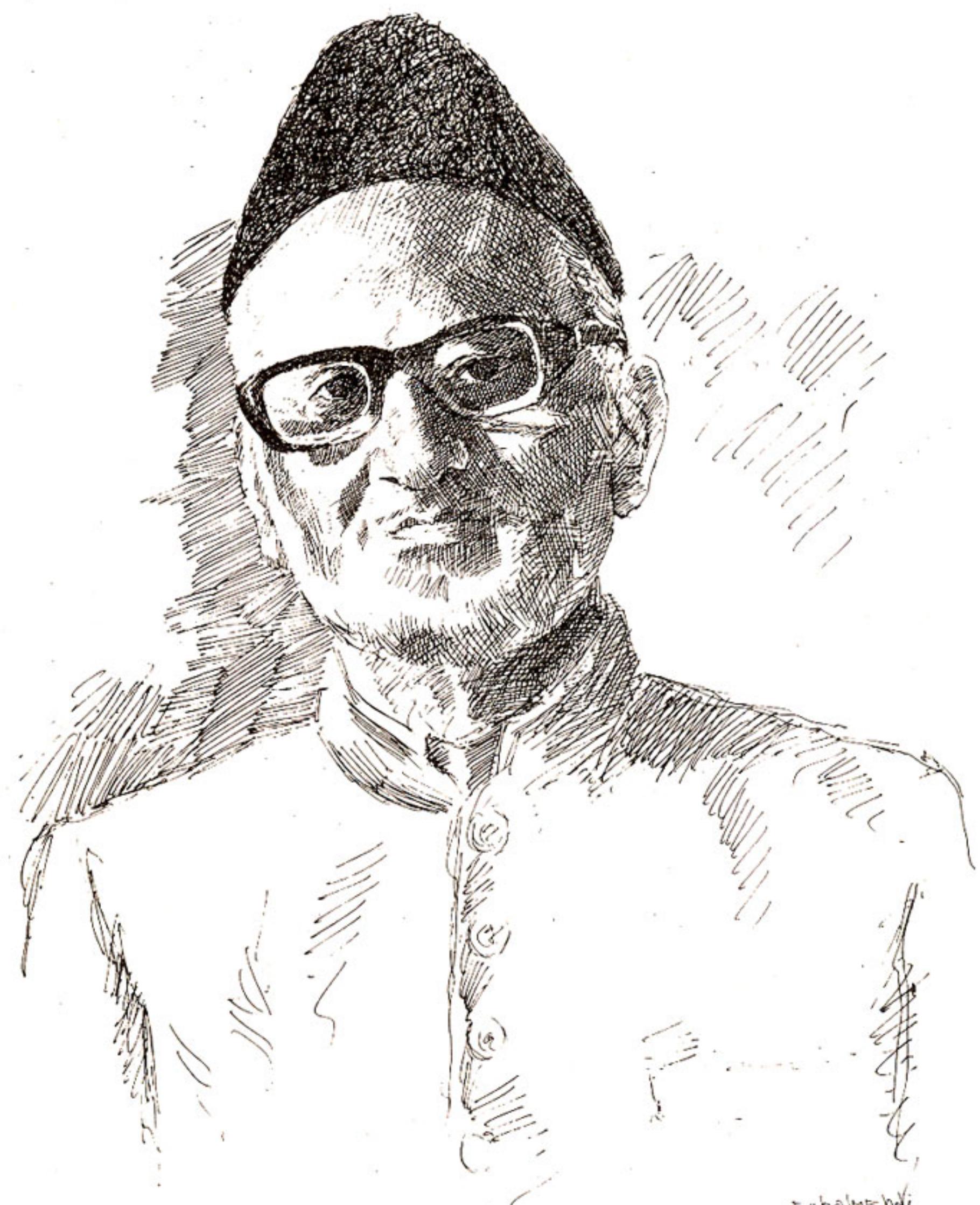
۳، جون ۱۹۰۸ء ڈیپلو، تھرپارکر
۷، فروری ۱۹۸۱ء حیدر آباد

محمدؐ عثمان ڈیپلائی

محمدؐ عثمان ڈیپلائی کو سندھی ادب کا بسیار نویس کہا جاتا ہے، اس لیے کہ انہوں نے پچاس برس تک مسلسل لکھا۔ دو سو سے زائد کتابوں کا مصنّف ہونا کوئی معمولی اعزاز نہیں۔
محمدؐ عثمان ولد حبیب اللہؒ میمن تھرپارکر کے ایک چھوٹے سے گاؤں "ڈیپلو" میں ۳ جون ۱۹۰۸ء کو پیدا ہوئے۔ ڈیپلو کو شاید ہی اتنی شہرت اُس کے ایک صدی کے باسیوں کے نام سے ملی ہو، جتنی شہرت اسے تنہا محمدؐ عثمان ڈیپلائی کے سبب حاصل ہوئی، بلکہ یہ کہا جائے کہ لفظ ڈیپلائیؔ سندھی ادب وصحافت کی دُنیا میں ایک انجمن ایک ادارے اور ایک منفرد تاریخ کا نام بن گیا تھا، تو بے جا نہ ہوگا۔
وہ بچپن ہی سے ذہین تھے۔ انہوں نے ساتویں جماعت تک ڈیپلو میں تعلیم حاصل کی پھر کاروبار میں مصروف ہوگئے، اس عرصے میں ذاتی صلاحیتوں کی بنیاد پر عربی، فارسی اور اردو سے واقفیت حاصل کی، کچھ عرصے بعد کاروبار کے لیے ڈیپلو سے باہر نکلے، مگر کاروبار کی بجائے زمینداروں کی نوکریاں کرنی پڑیں۔ ٹنڈو باگو، بدین کھپرو، میرپور خاص اور عمر کوٹ میں تلاشِ معاش کے لیے گھومتے رہے۔ ان ملازمتوں کے دوران وقت ملتا تو اسے کُتب اور رسائل پڑھنے میں صرف کرتے۔ دہلی کے مشہور اردو رسالے "منادی" میں محمدؐ بن قاسم کے بارے میں غلط تاریخی حوالوں سے مضمون شائع ہوا تو ڈیپلائی نے اس کے مدیر خواجہ حسن نظامی کو جو خط لکھا وہ ان کا پہلا مضمون بن گیا۔
ڈیپلائی کی پہلی کتاب "قرآنی دعائیں" ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب پر ان کے نام

کے ساتھ لفظ ڈیپلائی چھپا اور ہمیشہ کے لیے ان کی ذات کا تعارف بن گیا۔ ان کی آخری کتاب "انقلاب ایران" ہے۔ یہ حُسنِ اتفاق ہے کہ ڈیپلائی کو ان کی پہلی کتاب پر بھی انعام ملا اور آخری کتاب پر بھی۔ یہ بات اس پہلو کو بھی اُجاگر کرتی ہے کہ اتنے طویل عرصے میں ان کی تحریر کی یکسانیت نہ صرف برقرار رہی، بلکہ اس کا حُسن بھی وقت کے سبب متاثر نہ ہوسکا۔

ڈیپلائی نے حُر تحریک پر "سانگھڑ" کے عنوان سے جو ناول لکھا اس پر رائٹرز گلڈ نے انعام دیا۔ انہیں اور بھی کئی کتابوں پر انعامات ملے۔

مرحوم ڈیپلائی نے آریہ سماج کے ہندوؤں کی مسلمان دُشمنی کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا اور مولانا عبدالحلیم شرر اور دوسرے مصنفین کے تاریخی اسلامی ناولوں کو سندھی کے قالب میں ڈھالا۔ ان کا ناول "ڈاہری رنگ محل" آریہ سماج کے ہندوؤں کے پروپیگنڈے کا منہ توڑ جواب تھا۔ ۱۹۴۱ء میں جب تحریکِ آزادی نے زور پکڑا تو ڈیپلائی اس کے لیے مصروفِ عمل ہو گئے، آج کا سب سے کثیرالاشاعت سندھی روزنامہ "عبرت" محمد عثمان ڈیپلائی کا ہی جاری کردہ ہے جسے انہوں نے ۱۹۴۱ء میں پہلے ماہانہ کتابی سلسلے کی حیثیت سے، پھر ہفت روزہ کی حیثیت سے جاری کیا اور جو آخر کار روزنامہ بنا۔

۱۹۴۲ء میں ڈیپلائی حیدرآباد منتقل ہو گئے، یہاں انہوں نے اپنا پریس بھی قائم کیا۔ ڈیپلائی نے آریہ سماج کے ہندوؤں کی طرح سندھ کے پیروں فقیروں کے خلاف زبردست قلمی جہاد کیا۔ وہ ان مذہبی رہبروں کے خلاف اپنی پیرانہ سالی تک برسرِپیکار رہے جو رہبری کے نام پر گمراہی کا سمندر رہیں۔ انہیں بڑھاپے میں اسی سلسلے کی ایک کتاب "شیخ المشائخ" لکھنے پر حوالات بھی جانا پڑا۔

ڈیپلائی کی بہت سی خوبیوں میں سے ایک خوبی ان کا حافظہ تھا، جو بہر حال صحافت میں کام کرنے والوں کے لیے اثاثہ ہوتا ہے۔ انہوں نے ۱۹۵۹ء سے ۱۹۶۱ء تک حیدرآباد سے ہفت روزہ "انسان" بھی نکالا جو اپنے وقت کا بہترین سندھی جریدہ تھا، مگر نوکر شاہی کی سازشوں کے سبب نہ صرف یہ رسالہ بند ہو گیا بلکہ ڈیپلائی کو بھی صعوبتیں اُٹھانی پڑیں۔ انہوں نے بھٹو کے دور میں روزنامہ "سندھ ٹائمز" کا اجراء کیا مگر اسے اچھی طرح چلا نہ سکے۔ یہ اخبار ان کے انتقال کے بعد بند ہو گیا۔

قیامِ پاکستان کے فوراً بعد ڈیپلائی جماعت اسلامی کی طرف راغب ہوئے۔ ان کے

پریس میں جماعت اسلامی سندھی لٹریچر چھپواتی، یہ خود مولانا مودودیؒ کی تقاریر اور کتابوں اور رسالوں کے ترجمے کر کے ان کی اشاعت کا اہتمام کرتے، لیکن جس جوش و خروش سے آغاز ہوا تھا اتنی ہی تیزی سے واپسی ہوئی اور ڈیپلائی جماعت اسلامی کے مخالف بن گئے۔ ون یونٹ کے دور میں ون یونٹ کے خلاف صحافیوں، ادیبوں اور طالب علموں کی مختلف تحریکوں میں ڈیپلائی ایک سندھی قوم پرست بن کر ابھرے۔

انہیں صحافی اور ادیب کی حیثیت سے جہاں حوالات اور جیل کی سیر کرنی پڑی وہیں ملکی اور غیر ملکی سیاحت کے مواقع بھی ملے۔

ڈیپلائی مرحوم کے ساتھ میری الفت اور محبّت کا سبب یہ تھا کہ وہ زندگی کے نازک ترین معاملات کو بچوّں کی طرح برتنے کے عادی تھے، ہر وقت لطیفہ گوئی، جملے بازی اور ہر حال میں خوش رہنے کی ادا ان کی شخصیّت کا حصہّ تھیں۔ لیکن کسی کی دل شکنی نہ کرتے۔ مجھے اکثر اپنے دور کے جماعت اسلامی کے قصّے سنایا کرتے۔ ایک بار مجھے ان سے نیاز مندانہ ملتے ہوئے دیکھ کر جماعت اسلامی، کے ایک جاہل حامی نے اپنے تیئں مجھ پر انکشاف کیا، کس ملحد سے بات کر رہے تھے"۔ میں نے سوچا جہاں ڈیپلائی کو پرکھنے کا انداز یہ ہو وہاں کس پڑھے لکھے کی دال گل سکتی ہے۔

میں نے اُس مُحتسب کو جواب تو نہ دیا مگر میری یہ رائے کبھی نہ بدل سکی بلکہ مزید پختہ ہوتی چلی گئی کہ ڈیپلائی ایک عظیم انسان ہے، ایک سچّا سندھی سپوت ہے، ایک مایہ ناز اور جرأت مند صحافی ہے اور ایک انتھک اور بے مثل ادیب ہے۔

جماعت اسلامی کے حامی اخبار اور رسائل میں لکھنے کے باوجود ڈیپلائی میری تحریروں کو باقاعدگی سے پڑھتے، میری طرز نگارش انہیں بے حد پسند تھی اور اس کا اظہار جب وہ اپنی اولاد کے سامنے کرتے تو میں مور کی طرح کبھی کبھی اپنے پیروں کی طرف دیکھا کرتا۔

جب میں نے چھ حرّوں کے قتل کی داستان لکھی اور صحافتی دنیا میں ایک ہلچل پیدا کردی تو حسبِ توقع سانگھڑ سے ایک پولیس پارٹی مجھے پکڑنے کے لیے حیدر آباد آپہنچی۔ میں مفرور ہوگیا لیکن پریس کے لوگوں میں یہ افواہ اُڑ گئی کہ مجھے گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ڈیپلائی مرحوم نے بغیر تصدیق کئے صرف میری محبّت کے جوش میں صفحہ اوّل پر خبر چھاپ دی۔ بعد میں حالات معمول آنے پر جب میں نے ان سے غلط خبر کی اشاعت پر شکوہ کیا تو بولے میں نے یہ سوچ کر خبر چھاپی تھی کہ

اگر تم واقعی پکڑے گئے ہو تو یہ خبر کم از کم تمہاری رسید تو بن جائے، وہ جانتے تھے کہ پولیس اس دور میں آدمی وصول کر کے رسید بھی نہیں دیتی۔

ڈیپلائی کی تصانیف کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اسے یہاں دُہرایا نہیں جاسکتا۔ اسی طرح ان کے ہمعصروں میں مولانا خیر محمدؐ نظامانی، سردار علی شاہ، شیخ علی محمدؐ، محمدؐ ابراہیم جویو، مولانا غلام محمدؐ گرامی، مولانا عبدالغفور سیتائیؒ جیسے نام شامل ہیں اور یہ فہرست بھی اتنی طویل ہے کہ اسے دُہرایا نہیں جاسکتا۔

نصف صدی تک لکھنے والا یہ "بوڑھا جوان"، ۷ فروری ۱۹۸۱ء کو داغ مفارقت دے گیا۔

ڈیپلائی کی آخری خواہش تھی کہ ان کے اخبار کے دفتر کی جگہ ان کا چھوٹا بیٹا حبیب الرحمٰن ایم بی بی ایس کرنے کے بعد کلینک کھولے اور لوگوں کی طب کے ذریعے خدمت کرے۔ ان کی یہ خواہش ۱۹۸۲ء میں مکمل ہو چکی ہے۔ ڈاکٹر حبیب الرحمٰن ڈیپلائی یہاں "السکینہ کلینک" چلا رہے ہیں۔

ڈیپلائی کے بڑے بیٹے محمدؐ علی ان دنوں مرکزی محکمہ درآمد و برآمد کراچی میں افسر ہیں، جب کہ منجھلے بیٹے عبدالرحمٰن سعودی عرب میں ٹیلی فون کے محکمے سے وابستہ ہیں۔

ڈیپلائی کی پانچ بیٹیاں ہیں اور سب شادی شدہ ہیں۔ ان میں سے ایک بیٹی ثریا سوز ڈیپلائی شاعرہ اور ادیبہ ہیں۔ انہوں نے باپ کے نام کو ادب کے میدان میں اپنے نام کے ساتھ زندہ رکھنے کا عزم کر رکھا ہے۔

ثریا سوز نے ڈیپلائی مرحوم کی دوسری برسی پر "جنگ" میں جو مضمون لکھا اس کا پہلا پیراگراف پڑھ لیجئے۔ ایک ادیب بیٹی کا ایک ادیب باپ کے لیے خراجِ عقیدت کا انداز

"میرے اردگرد بہت سے رسالے ہیں اور ہاتھوں میں ہفت روزہ "انسان" حیدرآباد کا ۲ مئی ۱۹۵۹ء کو شائع ہونے والا ایک پرچہ ہے" یہ خاص پرچہ ہے اور اس پر "شہید انسانیت نمبر" لکھا ہوا ہے۔

یہ پرچہ سندھ کے مشہور ادیب اور صحافی محمدؐ عثمان ڈیپلائی کے زیر ادارت شائع ہوتا تھا اور بے حد مقبول تھا۔ "تھا" لکھتے ہوئے نہ جانے کیوں دل بھر آیا ہے اور یوں لگتا ہے کہ اشک چھلکنے کو ہیں!! لیکن نہیں!! میں ان اشکوں کو گرنے نہ دوں گی۔ کیونکہ جن کے بارے میں، میں آج لکھ رہی ہوں، وہ اس دن بھی نہ روئے جب ان کی دو بیٹیوں فاطمہ اور ثریا کی اور ایک بیٹے محمدؐ علی کی شادی تھی۔ لیکن وہ خود سیفٹی ایکٹ کے تحت نظر بند تھے۔ ان کی شریکِ حیات

(ہماری قابلِ فخر والدہ) بیگم سکینہ ڈیپلائی نے خالی ہاتھ ہوتے ہوئے بھی تین بچّوں کو بیاہ دیا! اور اس وقت تو سب ہی روئے تھے جب رخصتی کے وقت میرے بابا کو چند گھنٹوں کے لیے گھر آنے کی اجازت ملی اور انہوں نے روایت کے برخلاف بیٹیوں کی سر پر ہاتھ رکھ کر کہا "مسکراتی ہوئی جاؤ اور مسکراتی ہوئی آنا!" نہ خود روئے نہ ہمیں رونے دیا۔ لوگ حیران تھے کہ یہ کیسا باپ ہے۔!!

بہو نے جب دہلیز پر قدم رکھا تو بیٹے اور بہو کو پھولوں کا گلدستہ پیش کرتے ہوئے کہا "ہمیشہ پھولوں کی طرح کِھلتے اور مہکتے رہو"۔

سندھ کے ممتاز ادیب و نقاد محمّد ابراہیم جویو نے اپنے مضمون میں ڈیپلائی کے بارے میں لکھا ہے کہ "جب سے میری ان سے واقفیت ہوئی، تقریباً ۲۰ برس سے، تب سے میں نے انہیں اپنے مفاد سے بے پروا پایا۔ ان کا دل مستقبل کی امیدوں سے لبریز رہتا، مجھے ان کے ساتھ دل جمعی سے بات کرنے کا جب بھی موقع ملا میں نے انہیں مستقبل کا کوئی حسین خواب دیکھتے ہوئے پایا"۔

آگے چل کر وہ لکھتے ہیں، "زندگی کے لیے ان کی روش میرے نزدیک کسی ناٹک یا کھیل کے ایسے کیریکٹر یا کردار جیسی ہے، جس کو ہرگز یہ پروا نہیں کہ وہ اسٹیج کے درمیان کھڑا ہے یا کونے میں یا پیچھے ہے اور تماش بینوں سے اس کو تحسین مل رہی ہے یا نہیں، بس وہ تو اپنا کردار ادا کرنے میں محو رہتا ہے"۔ جناب جویو کے خیال میں، "ڈیپلائی کی زندگی ہیرو کی زندگی رہی ہے، خاموش، پائیدار اور مسلسل۔ اپنی اولاد کے لیے، اپنے گاؤں ڈیپلو کے لیے، اپنے ضلع تھر کے لیے اور اپنے ہم وطن لاکھوں انسانوں کے لیے اور ہم جیسے کچھ آدھے پاگل اور آدھے سیانوں کے لیے جو اپنے آپ کو ادیب کہتے ہیں"۔

اسی مضمون میں وہ لکھتے ہیں، "جب میں نے ڈیپلائی صاحب کے ادب یا ذاتی کردار کا مطالعہ کیا تو مجھے یہ محسوس ہوا کہ سوائے ان کے ابتدائی تصنیفی دور کے، جس کو وہ خود ہی اپنی جہالت کا دور کہتے ہیں، ڈیپلائی صاحب کے سامنے بدی کے چار زندہ نشان یا کردار رہے ہیں، ہم سب کو ان کرداروں کے نام معلوم ہونے چاہئیں کیونکہ اس کے بعد ہی سندھ کے حوالے سے ڈیپلائی صاحب کے سورمائی کردار کو ہم سمجھ پائیں گے۔ ڈیپلائی صاحب کے سامنے وہ چار ولن یہ ہیں۔ ایک پیر، دوسرا ملاّ، تیسرا زمیندار اور ساہوکار اور چوتھا بیوروکریٹ۔

سندھ اور سندھی سماج کی تمام تر بدنصیبی کے ذمّہ دار یہی چار عنصر ہیں"۔

آخر میں وہ لکھتے ہیں، ڈیپلائی مرحوم ایک پُربہار شخصیت کے مالک تھے، خود نمائی اور زر رسائی ان سے کوسوں دور تھے۔ آخری دنوں میں اکثر میری ان سے ملاقاتیں رہی تھیں۔ ان کی شگفتہ طبیعت میں وہی تازگی تھی، مگر ان کے بڑھاپے کا خیال رکھتے ہوئے میں ان سے زیادہ باتیں کرنے سے احتراز کیا کرتا تھا، البتّہ ان کی حکائتیں اور پُرلطف جملے اور شعر وغیرہ لکھ لیتا تھا۔ آخری دنوں میں انہوں نے ایک اُردو شعر مجھے سُنایا، جس نے مجھ پر نشہ طاری کر دیا۔ میں چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے اس شعر کو گنگنایا کرتا تھا۔ یہ شعر انسانی اُمنگ اور جذبے کی بے انداز اور بے شمار صفتوں کے بارے میں ہے۔

لکھی جائینگی کتابِ دل کی تفسیریں بہت
ہوں گی اے خوابِ جوانی تری تعبیریں بہت
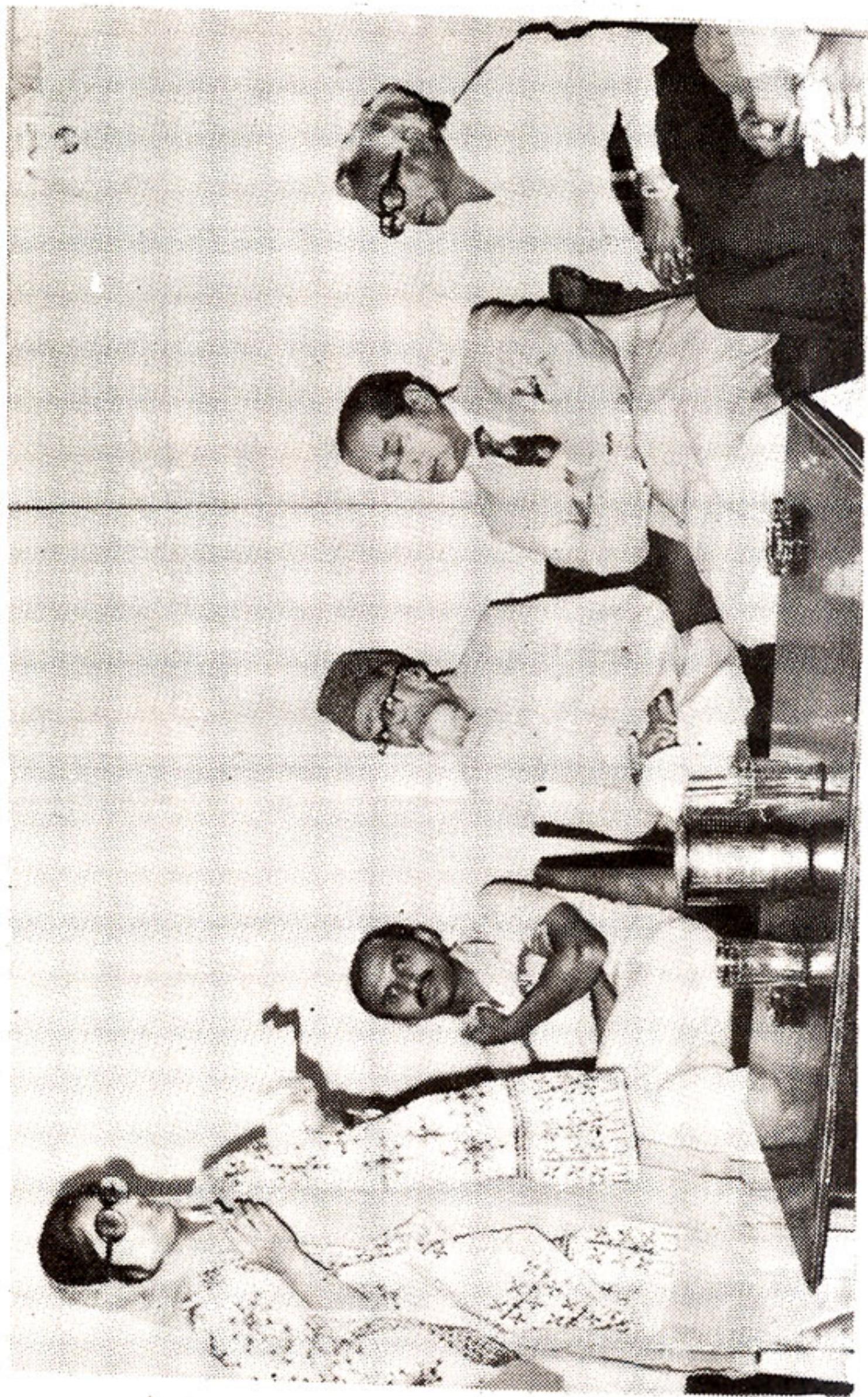
حیدرآباد پریس کلب میں عثمان ڈیپلائی کی پہلی برسی کے موقع پر تقریب۔ ثریا سوز ڈیپلائی کا خطاب۔ مولانا ندوی، قاضی عابد، شارفوٹوگرافر اور مصنف ہمہ تن گوش ہیں

یکم جنوری ۱۹۲۸ء گھوٹکی، سکھر
۱۸، مئی ۱۹۸۱ء کراچی

سیّد سردار علی شاہ

پیر پگاڑو کے ترجمان اخبار "مہران" کے مدیر سید سردار علی شاہ، جو شاعری میں "ذاکر" تخلص کرتے تھے، سندھی صحافت کے وہ شمشیر برہنہ تھے، جس کی آب و تاب سالہا سال نگاہوں کو خیرہ کرتی رہے گی۔

میں نے جب صحافت میں قدم رکھا تو سردار علی شاہ میری عمر سے زیادہ عرصے تک اس دشت کی سیّاحی کر چکے تھے، مگر ہم خیال ہونے کے سبب مجھے ان کی قرابت ہم عصر دوستوں کی طرح ملی۔

بھٹو دور میں پیر پگاڑو سے مخاصمت اور محاذ آرائی کا آغاز اس وقت ہوا، جب پیر پگاڑو کو خیر پور کے ڈپٹی کمشنر سے نوٹس دلوایا گیا۔ اس نوٹس کے جواب میں سید سردار علی شاہ نے پیر صاحب کے ترجمان کی حیثیت سے ستمبر ۱۹۷۲ء میں پریس کلب میں پریس کانفرنس سے خطاب کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب "جسارت" کی رپورٹنگ انتہائی بے سروسامانی کے عالم میں کرنی پڑتی تھی۔ ٹیلی فون کی کوئی سہولت نہیں تھی۔ لہٰذا جب کوئی بڑی خبر ہوتی تو میں کراچی چلا جاتا۔ یہ پریس کانفرنس بھی میں کراچی لے کر گیا، جو شہ سُرخی کے ساتھ شائع ہوئی۔

میں نے اس واقعہ پر "زندگی" میں مکتوب لکھا تو سردار علی شاہ نے بے حد سراہا۔ یہی وہ دن تھے، جب میں ان کے قریب آیا۔

۱۹۷۳ء کے اوائل میں سردار علی شاہ کے لیے مصائب کے دور کا آغاز ہوا۔ گرفتاری، رہائی اور گرفتاری، مقدمات، اخبار کی بندش، مارکیٹ تھانے کے ایس ایچ او کے ذریعے

پریس کی تالا بندی، یہ سلسلہ بہت دن تک جاری رہا۔

برادم شمس جعفرانی جوانِ دنوں "مہران" میں سب ایڈیٹر تھے اور خود سردار علی شاہ کے فرزند سکندر علی شاہ گواہ ہیں کہ میں نے سائیں سردار علی شاہ کے مصائب و آلام پر جان توڑ کر لکھا جولائی ۱۹۷۳ء میں "زندگی" کے سرِ ورق پر سردار علی شاہ کی تصویر شائع کرائی اور اسی تصویر پر لکھے گئے کیپشن سے انہیں سردارِ صحافت کا لقب ملا، جو ان کے نام کا حصہ بن گیا۔ جب کہ اگست ۱۹۷۶ء میں انہیں سید علی میر شاہ نے "پاسبانِ آبروئے قلم" کا لقب دیا۔

سردار علی شاہ کی شخصیت کے بارے میں میرا تجزیہ یہ رہا ہے کہ وہ ضد کے پکے، زُود رنج اور اپنے مؤقف پر ڈٹ جانے والے شخص تھے۔ جس بات کو دُرست سمجھتے اس کے خلاف کوئی دلیل سُننے کو تیار نہ ہوتے۔ ۱۹۷۲ء کے لسانی فسادات میں ان پر وطنی عصبیت کا غلبہ ہوا، مگر پھر اسلام کی عصبیت کا رنگ اس طرح چڑھا کہ پاکستانی قومیت کے قائل بھی نہ رہے۔

آخری زمانے میں ان کی ایک نعت کو جو غالباً کینجھر کے عنوان سے نظم کے انداز میں لکھی گئی تھی "ہلالِ پاکستان" میں شائع کیا گیا اور مضمون نگار نے اس کی غلط تشریح کی تو مجھے بُلا کر کہا کہ میری طرف سے یہ تردید چھاپ دیجیے کہ یہ نظم نہیں ہے نعت ہے اور کینجھر جھیل دراصل ایک علامت ہے جس کی تعریف کرتے ہوئے میں نے سرورِ پاکؐ کی مدح کی ہے۔ اسی گفتگو میں انہوں نے کہا کہ میں کسی قومیت کا قائل نہیں خواہ وہ مُسلم قومیّت ہو یا پاکستانی قومیت، تو پھر سندھی قومیّت کا ہمنوا کس طرح ہو سکتا ہوں۔

حالانکہ جب نومبر ۱۹۷۷ء میں "اسلامی جمہوریہ" میں تعلیمی اداروں کے بارے میں میری ایک تحریر شائع ہوئی تو سردار علی شاہ نے ۱۲ نومبر ۱۹۷۷ء کے "مہران" میں سندھی قومیّت کے ہاتھوں مغلوب ہو کر میرے خلاف ایک طویل اداریہ لکھا "فتنہ انگیزی کی روش" کے عنوان سے انہوں نے الزام عائد کیا کہ میں نے "تعلیم کے نام پر جہالت کا کاروبار" کے عنوان سے، جو مضمون لکھا ہے۔ اس میں محکمہ تعلیم کے سندھی افسران کو خاص طور پر نشانہ بنایا ہے۔

غالباً یہ اداریہ مرحوم نے محکمہ تعلیم کے اپنے بعض دوستوں کی دوستی کی خاطر تحریر کیا تھا۔ میں اس اداریے پر عرصے تک کبیدہ خاطر رہا، مگر ان سے اپنی محبت اور عقیدت کو نہ چھوڑا۔ سید سردار علی شاہ صاحب جب فریضۂ حج ادا کر کے لوٹے تو صاحبِ فراش تھے۔ مجیبُ الرّحمان

شامی کے ہمراہ ان کی عیادت کی تو پہلی بار انہیں مایوس دیکھا۔ سندھی صحافت، مہران اور خود اپنے مستقبل کے لیے پریشان تھے، ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہوئی کہ "مہران"، کو وہ خود آفسٹ پر شائع کرتے۔

سردار علی شاہ کے تین بھائی ہیں۔ بڑے بھائی بہاول شاہ اور چھوٹے بھائیوں میں سرور علی شاہ اور امیر علی شاہ جبکہ اولاد میں چار بیٹے اور تین بیٹیاں بیٹوں میں سکندر علی شاہ سب سے بڑے ہیں، کچھ عرصہ "مہران" سے وابستہ رہے مگر وہاں گزر نہ ہوسکی تو ایک کول کمپنی میں ملازمت اختیار کرلی، امان اللہ شاہ ٹیکنیکل کالج میں اور عطاء اللہ شاہ اور عنایت اللہ شاہ نور محمد ہائی اسکول میں طالب علم ہیں۔ رفیقۂ حیات بھی بچوں کی تعلیم کی خاطر حیدرآباد میں رہتی ہیں۔

سردار علی شاہ کے بھائی امیر بخاری نے اپنے عظیم بھائی کی موت پر جولائی ۱۹۸۱ء کے "نئی زندگی" میں، جو ممتاز سندھی جریدہ ہے، مضمون لکھا۔ اس تفصیلی مضمون کے اقتباسات پیشِ خدمت ہیں:

یکم جنوری ۱۹۲۸ء سے ۱۸ مئی ۱۹۸۱ء تک ایک انسان اس دنیا میں ۵۳ سال ۴ ماہ اور ۱۷ دن متحرک زندگی گذارنے کے بعد طبعی انداز میں اپنا تحرک ختم کرگیا لیکن معنوی لحاظ سے اس وقت تک اس کا تحرک ختم نہیں ہوسکتا جب تک یہ دُنیا تحرک میں ہے۔

ضلع سکھر، تعلقہ گھوٹکی کے گاؤں بیرڑی کی کچی جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ کس طرح پلا بڑھا، جوان ہوا اور مجاہدانہ زندگی گزار کر یہاں کی تاریخ کا ایک سردار بن گیا۔

یہ ایک بڑی کہانی ہے۔ بخاری سادات خاندان کے اس فرد کے ذکر کے لیے ایک مضمون یا ایک کتاب نہیں پورا دفتر درکار ہوگا۔ عام بچوں سے مختلف انداز میں پرورش پانے، ماتھیلو تعلقہ گھوٹکی میں پرائمری تعلیم حاصل کرنے، ڈنو ماکھو اور میرپور ماتھیلو میں مزید تعلیم کے لیے وقت گزارنے، گورنمنٹ ہائی اسکول نوشہرو فیروز میں پڑھنے، لوکل بورڈ ہائی اسکول نواب شاہ میں حصولِ علم کا چراغ جلانے اور سندھ مسلم کالج کراچی اور سندھ یونیورسٹی سے وابستہ رہنے والا، سردار علی شاہ کا ہر دور نرالا اور وسیع مطالعے کا متقاضی ہے۔

سردار علی شاہ کی ماں کی روایت ہے کہ "میرے ہاں ابھی تمدن" (سردار علی شاہ) بطن میں نہ تھا کہ ایک فقیرنی آئی اور کہا کہ "اللہ کے نام پر کوئی کپڑا دو"، میں نے اسے کپڑا بھی دیا اور کھانا بھی کھلایا۔ فقیرنی نے دُعا دیتے ہوئے کہا کہ "تیرے ہاں نشانی رکھنے والا بیٹا پیدا ہوگا

جو قسمت والا ہو گا۔"

ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ سردار علی شاہ کی پُشت پر نشانی تھی، جو کہ جسم کے رنگ سے جُدا رنگ والی تھی اور اُس پر بال تھے۔

ماں نے سائیں کی پیدائش کے بارے میں، جو باتیں بتائیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ "ننھا سردار نہ کبھی رویا، نہ شرارت کی اور نہ مار کھائی۔" خاموش طبع اور غور و فکر کرنے والا۔ جب پڑھنے کے لائق ہوا تو اسے ماتھیلو اسکول بھیج دیا گیا، جو بیرڑی سے ایک میل دور ہے۔ اب یہیں کے نزدیکی قبرستان میں ان کی آخری آرام گاہ ہے۔

پرائمری سکول کے دَور کی بات ماں نے بتائی کہ ایک رات نصف شب کو اٹھی، سردار کی چارپائی کی طرف دیکھا تو نظر نہ آیا، میں نے اسے دوسری چارپائی پر تلاش کیا۔ دل میں وسوسے پیدا ہونے لگے۔ پریشان ہو کر اس کے باپ کو جگایا۔ انہوں نے بھی میرے ساتھ پُورا گھر تلاش کیا، مگر نظر نہ آیا۔ وہ پریشان ہو کر باہر تلاش کو نکلے تو انہیں یاد آیا کہ سردار علی شاہ نے کہا تھا کہ صبح بہت سویرے اسکول جاؤں گا کیونکہ سویرے جانے پر اچھے نمبر ملیں گے۔ لہٰذا وہ ماتھیلو روانہ ہوئے۔ یہاں اسکول کے برآمدے کے کونے میں "شدن" بیٹھا تھا۔ انہوں نے آواز